مارچ ۲۰۰۶ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ

توہین رسالت پر مبنی کارٹونوں کی اشاعت اور اس پر مسلمانوں کے ردّعمل کے تناظر میں

اُمّتِ مسلمہ کے لیے قرآنی لائحۂ عمل

سورۃ الصّف کی روشنی میں

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید کے ۷ فروری کے خطابِ جمعہ کی تلخیص

ڈنمارک کے اخبار میں توہین رسالت پر مبنی خاکوں کی اشاعت انتہائی گھناؤنی حرکت ہے۔ بجائے اِس کے کہ اِس ناپاک جسارت پر معذرت کی جاتی' حددرجہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے اظہارِ رائے کی آزادی کا نام دیا جارہا ہے۔ یورپی یونین' امریکہ اور اسرائیل نے ڈنمارک کے اِس اقدام کی کھل کر تائید کی اور اُس سے اظہارِ یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ آزادیٔ صحافت کے معاملے میں کوئی دباؤ قبول نہ کیا جائے۔ حالانکہ یہ آزادیٔ صحافت کا نہیں دوسروں کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کا معاملہ ہے۔ اور یورپی اقوام کے دساتیر اور اقوام متحدہ کے چارٹر میں یہ بات شامل ہے کہ کسی کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

ڈنمارک سے اظہارِ یکجہتی کے ساتھ ساتھ مغربی دنیا کے دیگر چالیس ممالک میں اِن دل آزار کارٹونوں کی اشاعت سے یہ بات عیاں ہوگئی ہے کہ یہ کارروائی حقیقت میں اسلام کے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش کا حصہ ہے' جو نئی صلیبی جنگوں کا مظہر ہے۔ اِس سے واضح ہوگیا ہے کہ اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کے دینی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے لیے تمام حدود پھلانگنے کو تیار ہیں۔ قبل ازیں گوانتاناموبے کے امریکی عقوبت خانے میں قرآن مجید کی توہین کی گئی' اور بھی کئی مقامات پر جہاں جہاں امریکہ قابض ہے اور مسلمان اُس کی قید میں ہیں' اُن کو ذہنی اذیت پہنچانے کے لیے دیگر ہتھکنڈوں کے ساتھ ساتھ توہین قرآن حکیم کا حربہ آزمایا گیا ہے۔

یہ بات خوش آئند ہے کہ توہین آمیز خاکوں کی اشاعت اور مغربی ممالک کے متعصّبانہ

ردِّعمل کے نتیجہ میں عالم اسلام میں بیداری آ رہی ہے۔حکومت پنجاب کے اہم عہدیدار جناب مواحد حسین شاہ کا یہ کہنا بجا ہے کہ ''اب مسلمان جاگ اُٹھا ہے۔ اِس شیر کو جگا دیا گیا ہے۔'' اِسی بیداری کا مظہر پوری دنیا میں اہلِ اسلام کے احتجاجی مظاہرے ہیں۔حکومتی سطح پر بھی بعض مسلمان ممالک نے پُر زور احتجاج کیا ہے۔ ایران' شام اور سعودی عرب نے سفارتی نمائندوں کو واپس بلا لیا ہے' سعودی عرب میں تو ڈنمارک کی مصنوعات کا بائیکاٹ بھی کیا گیا ہے' اگرچہ ہماری حکومت کو جو کچھ کرنا چاہیے تھا اُس کا عشرِ عشیر بھی نہیں کیا۔ بہرحال دنیا بھر میں مسلمان بیدار ہو رہے ہیں اور بقول اقبال ؏

''مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے!''

ہمارے ہاں عوامی سطح پر احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ اگرچہ دیر سے شروع ہوا ہے' مگر عوام نے اس ناپاک جسارت کے خلاف کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔تاہم اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اِن مظاہروں میں ہونے والی توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ انتہائی قابل مذمت ہے۔اس سے عالمی سطح پر بھی پاکستان کا امیج خراب ہوا ہے۔ ہمارا ملک پہلے ہی سازشوں کی زد میں ہے' بلکہ یہ سازشی ایجنسیوں کی سب سے بڑی چراگاہ ہے۔ اِس سے مغرب کو مسلمانوں کے خلاف مزید پروپیگنڈے کا موقع مل رہا ہے۔ یہ ہماری حکومت کی شدید نااہلی کا ثبوت بھی ہے' اِس لیے کہ حکومت نے اپنا فریضہ ادا نہیں کیا۔جن لوگوں نے ٹی وی پر ان مظاہروں کی رپورٹ دیکھی ہے' وہ بتاتے ہیں کہ کچھ چھوکرے آئے اور انہوں نے توڑ پھوڑ شروع کر دی مگر انہیں فری ہینڈ دیا گیا۔ پولیس دیکھتی رہی' اُس نے کچھ نہ کیا۔اب کوشش کی جارہی ہے کہ اِس کا الزام دینی جماعتوں پر دھرا جائے' لیکن یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ دینی جماعتوں کی کارروائی نہیں ہے بلکہ اِس میں کچھ اور عناصر ملوث ہیں جو اسلام اور پاکستان کے خیرخواہ نہیں ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اِس صورتحال میں کرنے کا اصل کام کیا ہے؟ کیا محض عوامی سطح پر احتجاجی جلسے' جلوس اور مظاہرے کیے جائیں اور بس' یا اِس سے بڑھ کر کرنے کا کام کچھ اور ہے۔ستاون مسلم ممالک کی حکومتوں کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے' ہماری دینی جماعتوں کو کیا کرنا چاہیے! اِس صورتحال کے تدارک کے لیے جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہے۔ایک لائحہ عمل طے کیا جانا ضروری ہے۔ ہاں جب غور و فکر کے بعد لائحہ عمل ترتیب دے لیا جائے تو اُس پر عمل کے لیے جوش و جذبہ درکار ہے۔

اس لائحہ عمل کے سلسلہ میں پہلی اور اصولی بات یہ ہے کہ توہین رسالت پر مبنی خاکوں کی اشاعت اور قبل ازیں امریکہ کے زیرِ انتظام جیلوں میں قرآن مجید کے ساتھ انتہا درجے کا توہین آمیز سلوک حقیقت میں اللہ کے برگزیدہ رسول ﷺ اور اُس کی کتاب مبین کی توہین نہیں بلکہ امت مسلمہ کی رسوائی ہے' میری اور آپ کی بے توقیری ہے۔ اگر کوئی آسمان پر تھوکے تو آسمان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' اُس کی رفعت اور عظمت پر کوئی دھبہ نہیں ڈال سکتا' اس کا نقصان اُسی کو ہوگا۔ چنانچہ مغرب کو اس کا نقصان یہ ہوا کہ اِس ناپاک جسارت سے اُس کی نام نہاد رواداری اور مذہبی آزادی کی حقیقت آشکارا ہو گئی ہے۔ وہ روشن خیالی اور رواداری جس کے لیے ہمارے سیکولر حکمران انہی ممالک کو ماڈل کے طور پر پیش کر رہے ہیں' جس کے لیے نصاب تعلیم سے جہاد و قتال سے متعلقہ آیات قرآنی کو نکال رہے ہیں' مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی عداوت اور دشمنی کے بیان پر مبنی آیات کو کھرچ رہے ہیں' معلوم ہو گیا ہے کہ رواداری کے حوالے سے اُن کا اپنا طرزِ عمل کس قدر گھناؤنا اور متعصّبانہ ہے۔

رواداری کی حقیقی تعلیم تو دین اسلام نے دی ہے۔ اس نے دوسروں کے مذہبی جذبات کا اِس درجے خیال رکھا ہے کہ اہل اسلام کو اُن کے جھوٹے خداؤں یعنی بتوں کو بھی گالیاں دینے سے منع کیا ہے۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ......﴾ (الانعام: ۱۰۸)

''اور جن لوگوں کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں اُن کو بُرا نہ کہنا' کہ یہ بھی کہیں اللہ کو بے ادبی سے' بے سمجھے بُرا نہ کہہ بیٹھیں۔''

تاریخ گواہ ہے کہ اہل اسلام نے غیر مسلموں کے جان' مال' عزت و آبرو اور عبادت گاہوں کی ہمیشہ اُسی طرح حفاظت کی جیسے مسلمانوں کے جان' مال اور مساجد کا تحفظ کیا۔

یہ کیسی رواداری ہے کہ دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی گئی' مگر نہ تو اِس پر معافی مانگی گئی اور نہ ہی مغربی دنیا میں کہیں اس کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کی حیثیت اور وقعت اُن کی نظر میں چیونٹی کے برابر بھی نہیں ہے۔ اُن کی ہمتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ جیسے چاہو مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرو' اس لیے کہ اُن میں کوئی دم خم نہیں ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

آج ہماری حالت اُس حدیث رسولﷺ کے عین مطابق ہے جس میں آپؐ نے فرمایا: عنقریب غیر مسلم قومیں تمہاری سرکوبی کے لیے ایک دوسرے کو بلائیں گی اور (پھر وہ سب مل جل کر) دھاوا بول دیں گی' جیسا کہ بہت سے کھانے والے افراد ایک دوسرے کو بلا کر دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ایک صحابیؓ نے عرض کیا: حضور! کیا اُس وقت ہماری تعداد تھوڑی ہوگی؟ آپﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں بلکہ اس وقت تم تعداد میں بہت کثیر ہوگے' لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے کوڑا کرکٹ اور جھاگ سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوگا کہ دشمن قوموں کے دل سے تمہارا رعب ختم ہو جائے گا اور تمہارے دل ''وَھْن'' کا شکار ہو جائیں گے۔ کسی نے پوچھا: یارسول اللہ! ''وَھْن'' کسے کہتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: دنیا سے محبت اور موت سے نفرت!

ظاہر ہے کہ جب دنیا اور اُس کا مال و متاع ہی انسان کی محنت و مشقت کا ہدف بن جائے تو پھر دین کی گواہی اور اُس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا نصب العین ذہن میں کیسے آ سکتا ہے۔ ایسے انسان کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت' نہ کشور کشائی

پھر مسلمان کفار کا تر نوالہ کیوں نہ بنیں گے!

ذرا سوچئے! ایک وقت وہ تھا جب مسلمانوں کے دبدبے کا یہ عالم تھا کہ سرزمین سندھ میں ایک مسلمان خاتون کی حرمت پامال ہوئی۔ اُس نے دہائی دی۔ جب اُس کی فریاد دربارِ خلافت تک پہنچی تو سترہ سالہ نوجوان جرنیل محمد بن قاسم کی قیادت میں ایک فوج بھیجی گئی جس نے راجہ داہر کو ہٹ دھرمی کا مزہ چکھا دیا تھا۔ اِس سے دنیا کو یہ پیغام ملا تھا کہ مسلمانوں کو کوئی بھی میلی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ ایک آج کا دور ہے کہ مسلمانوں کی بے حمیتی کا یہ حال ہے کہ ہماری محبوب ترین ہستی حضرت محمد رسول اللہﷺ فداہ ابی و امی کی حرمت پر انتہائی رکیک حملے کیے جا رہے ہیں اور مسلمان حکمرانوں میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ اِن ممالک سے سفارتی تعلقات ہی منقطع کر لیں۔ یاد رکھئے! اگر اللہ تعالیٰ نے کل مسلمانوں کو سربلندی عطا کی تھی' تو سربلندی و کامرانی کا وعدہ اب بھی قیامت تک کے لیے ہے' بشرطیکہ ایمان و یقین کے

تقاضوں کو پورا کیا جائے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ﴾ (آل عمران)

''اور اگر تم مؤمن ہوئے تو تم ہی سربلند ہو گے''

اصل بات یہ ہے کہ جب ہم اپنا مشن بھول گئے' دنیا کی زندگی اور اُس کی زیب وزینت کو اپنا مقصدِ حیات بنالیا' تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اور رحمت سے محروم ہو گئے ہیں۔

برادرانِ اسلام! یہ بات طے شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالآخر اپنے دین کو غالب کرنا ہے' اگرچہ مشرکین اور کفار کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے' اگرچہ کفر کی طاقتیں' خاص طور پر اُن کے سرخیل یہود توحید کے چراغ کو گل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں۔ چنانچہ سورۃ الصّف میں فرمایا:

﴿يُرِيۡدُوۡنَ لِيُطۡفِئُوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوۡرِهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ﴾

''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو منہ سے پھونک مار کر بجھا دیں حالانکہ اللہ اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا' چاہے کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔''

بقول شاعر

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

چنانچہ اگلی آیت میں یہی بات نبی اکرم ﷺ کے مقصد بعثت اور مشن کے طور پر بیان کی گئی:

﴿هُوَ الَّذِيۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَ دِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو ''الہدیٰ'' اور دینِ حق کے ساتھ' تاکہ وہ اُسے کل نظامِ اطاعت پر (تمام ادیان پر) غالب کر دے' چاہے مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے''

سوال یہ ہے کہ اللہ کا دین' کل روئے ارضی پر کیسے غالب ہوگا؟ نبی ﷺ کا یہ مشن کیسے پورا ہوگا؟ یہ کام معجزانہ طور پر نہیں ہوگا' بلکہ اسلام کے عالمی غلبہ کے لیے ایک جان گسل محنت اور مجاہدہ ضروری ہے۔ مسلمانوں کو اِس راہ میں آنے والے تمام مشکل مراحل سے گزرنا پڑے گا' اُن کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔ اگر محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

کو اِس راہ میں سخت اذیت ناک مراحل سے گزرنا پڑا تب جا کر جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کا دین غالب ہوا' تو یہ کیسے ممکن ہے کہ محض خواہشات اور تمناؤں سے اسلام غالب ہو جائے اور مسلمانوں کو شان وشوکت نصیب ہو جائے! یہی وجہ ہے کہ اگلی آیات میں عذابِ الیم سے چھٹکارا پانے اور دنیا میں سربلندی کے لیے مسلمانوں کو ایمان و یقین کی پختگی اور غلبۂ دین کی خاطر جانوں اور مالوں کے ساتھ جہاد کا لائحہ عمل دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَیُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۲﴾ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳﴾﴾

''مؤمنو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذابِ الیم سے مخلصی دے (وہ یہ کہ) اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ' اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ اگر سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغہائے جنت میں' جن کے دامن میں نہریں بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشت ہائے جاودانی میں (تیار) ہیں' داخل کرے گا۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور ایک اور چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو یعنی تمہیں خدا کی طرف سے مدد نصیب ہو گی اور فتح عنقریب ہو گی' اور مومنوں کو اس کی خوشخبری سنا دو۔''

قرآنی لائحہ عمل میں پہلی بات ہے: ﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ یعنی ''اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر پختہ یقین رکھو''۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا دعوائے ایمان محض زبانی نہ ہو بلکہ عمل سے اُس کی تصدیق بھی ہوتی ہو۔ تمہارے اعمال گواہی دیتے ہوں کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور اُس کے رسول ﷺ کو اللہ کا رسول مانا ہے۔ اگر عملاً اسوۂ رسول ﷺ سے تمہارا کوئی ناتا ہی نہ ہو' بلکہ سنت کا استہزا کرتے رہو تو تمہارا عشقِ رسول ﷺ کا دعویٰ اللہ کے ہاں قبول نہیں کیا جائے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ﴿تُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ﴾ یعنی ''اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور جانوں سے جہاد کرو''۔ عذابِ الیم سے چھٹکارا پانے اور نبی ﷺ کے مشن کو پورا کرنے کے لیے لازمی شرط یہ بھی ہے کہ تمہیں اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہو گا۔ تمہیں اپنے مال بھی خرچ کرنا ہوں گے اور اپنے اوقات' اپنی صلاحیتیں اور جسم و جان کی

توانائیاں بھی لگانی ہوں گی۔

تیسری بات یہ بھی ذہن میں رہے کہ ﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی ’’یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھو‘‘۔ اللہ کی راہ میں جب بھی جہاد اور قربانی کا تقاضا آتا ہے‘ انسان کے ذہن میں فوراً یہ وسوسہ آتا ہے کہ اگر میرے جسم و جان کی ساری توانائیاں غلبہ دین کی جدوجہد میں لگ گئیں تو میرا کاروبار کیسے ترقی کرے گا‘ میں بچوں کو تعلیم کیسے دلواؤں گا‘ وغیرہ۔ فرمایا‘ ایسا نہ سوچو‘ دین کی راہ میں جدوجہد تمہارے لیے سب سے بہتر راستہ ہے۔

آگے دنیا و آخرت میں اس پختہ ایمان اور مجاہدہ فی سبیل اللہ کی جزا بیان کی جارہی ہے کہ اگر تم ایسا کرنے لگو تو آخرت میں اس کا اجر یہ ہے کہ ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ ’’وہ (اللہ) تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تمہیں جنت کے باغات میں داخل کر دے گا‘ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور تمہیں بہشت ہائے جاودانی میں پاکیزہ مکانات عطا کرے گا یہ ہے بڑی کامیابی‘‘

جبکہ دنیا کا اجر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں فتح و نصرت اور کامرانی عطا فرمائے گا ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ’’اور ایک اور چیز جس کو تم چاہتے ہو‘ یعنی اللہ کی طرف سے تمہیں مدد نصیب ہوگی‘ اور فتح حاصل ہوگی اور (اے نبیؐ) مؤمنوں کو اس کی خوشخبری سنا دو۔‘‘

پس معلوم ہوا کہ آخرت میں کامیابی کے ساتھ ساتھ دنیا میں سربلندی اُسی صورت ممکن ہے جب اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے شامل حال ہو۔ اور ایسا تب ہی ممکن ہے جب ہم اُس کے بتائے ہوئے لائحہ عمل کو اختیار کریں‘ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت بجالائیں اور غلبۂ دین حق کی جدوجہد میں اپنی جان‘ مال اور صلاحیتوں کی قربانی دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِس لائحہ عمل کے بیان کے فوراً بعد مسلمانوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اللہ کے مددگار بنیں۔ یعنی نبی ﷺ کے مشن کو پورا کرنے کے لیے اپنا سب کچھ راہ خدا میں لگا دیں۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ... ﴾

’’مؤمنو! اللہ کے مددگار بن جاؤ‘ جیسے عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا کہ بھلا کون ہے جو اللہ کی طرف بلانے میں میرا مددگار رہو؟ حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے مددگار رہیں!‘‘

سورۂ محمدﷺ میں یہی بات دوسرے انداز سے کہی گئی ہے' فرمایا کہ اگر تم مضبوطی و استحکام چاہتے ہو تو اللہ کی مدد کرو' یعنی اُس کے دین کے غلبہ اور احقاقِ حق کی خاطر جدوجہد کرو' اللہ تمہارے پاؤں جما دے گا۔ فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ﴾

''اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا' اور تم کو ثابت قدم رکھے گا۔

ہماری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ توہین رسالت پر مبنی خاکوں کی اشاعت حقیقت میں ملّت اسلامیہ کی رسوائی اور توہین ہے اور یہ دراصل اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ہماری بداعمالیوں کے باعث امتِ مسلمہ اِس وقت اللہ کی طرف سے ذلت و مسکنت کے عذاب میں گرفتار ہے۔ مسلمانوں کی اِس رسوائی سے نجات کا اصل ذریعہ رجوع الی اللہ ہے۔ چنانچہ جہاں یہ ضروری ہے کہ

☆ اِس ناپاک جسارت پر اپنے جذبات کے اظہار کے لیے توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ سے اجتناب کرتے ہوئے پُرامن' مؤثر احتجاجی مظاہرے کیے جائیں۔
☆ شنیع حرکت کے مرتکب ممالک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا جائے۔
☆ ریاستی سطح پر مسلمان ممالک فوری طور پر ڈنمارک سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کریں۔
☆ دیگر ممالک سے بھی جہاں یہ توہین آمیز خاکے چھاپے گئے ہیں' سفارتی سطح پر سخت ترین احتجاج کیا جائے۔
☆ معافی نہ مانگنے کی صورت میں ''تیل کا ہتھیار'' استعمال کیا جائے۔

وہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اِس صورتحال کا اصل علاج یہ ہے کہ:

☆ مسلمانانِ عالم اپنے گناہوں پر سچی توبہ کرتے ہوئے اللہ اور اس کے رسولﷺ پر اپنے ایمان و یقین کو پختہ کریں۔ احکامِ شریعت پر عمل کریں اور یہود و نصاریٰ کے طرز زندگی کو کلیۃً ترک کر دیں۔
☆ اللہ کے دین کی سربلندی اور نبویؐ مشن کی تکمیل کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ اِس کے لیے اپنی جان' مال' صلاحیتوں اور اوقات کی قربانی دیں' تا کہ اللہ کا کلمہ سربلند ہو' فرزندانِ توحید آخرت میں کامیاب و کامران ہوں اور دنیا میں بھی انہیں عزت و وقار اور قوت حاصل ہو۔

(مرتب: محبوب الحق عاجز)

1

حقیقت واقسامِ شرک (۲)

بانئ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم ۔ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِہٖ وَھُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾﴾ (لقمٰن) ...... صدق اللّٰہ العظیم

''اور یاد کرو جب کہ لقمان نے کہا اپنے بیٹے سے' اور وہ اسے نصیحت کر رہے تھے' کہ اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجئے یقیناً شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے''۔

''حقیقت واقسامِ شرک'' کے موضوع پر مفصل گفتگو کا جو سلسلہ شروع ہو چکا ہے یہ اس کی دوسری نشست ہے۔ گزشتہ نشست میں الحمد للہ اقسامِ شرک کے حوالے سے شرک کی پہلی قسم ''شرک فی الذات'' کی بحث کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں جان لیجیے کہ گزشتہ اقوام میں سے جو قومیں بھی شرک فی الذات میں مبتلا ہوئیں ان میں سے کسی نے بھی اللہ کے لیے بیوی تسلیم نہیں کی۔ سورۃ الانعام میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰی یَکُوْنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَکُنْ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ ؕ﴾(آیت ۱۰۱)

''وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہوسکتا ہے' جبکہ کوئی اس کی شریکِ زندگی (بیوی) ہی نہیں ہے؟''

عیسائیت کے بارے میں یہ بات جان لیجیے کہ اگرچہ عیسائیوں میں اس شرک ''شرک فی الذات'' نے سب سے زیادہ بدترین صورت اختیار کی اور یہ شرک اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا' لیکن عیسائیوں میں بھی جو دو تثلیثیں رائج رہی ہیں اُن میں پہلی تثلیث (Trinity) جو ابتداء میں زیادہ مانی جاتی تھی وہ یہ ہے:

God the Father, Mary the mother and Jesus the son.

یعنی باپ' بیٹا اور ماں تین الٰہ ہیں اور اس تثلیث میں حضرت مریم سلامٌ علیہا ماں کے رشتے سے الوہیت میں شریک ہیں' خدا کی بیوی ہونے کی حیثیت سے نہیں! اور اس میں بڑا فرق ہے۔ اِس جدید دور میں اس تثلیث کو ماننے والے بہت کم عیسائی ہیں۔ اب جو تثلیث رائج ہے' جو نسبتاً زیادہ فلسفیانہ ہے' وہ یہ ہے:

God the Father, Jesus the son and the Holy Spirit (Ruh-ul-Qudus).

یعنی باپ' بیٹا اور روح القدس۔ اس تثلیث میں سے حضرت مریم سلامٌ علیہا کو نکال دیا گیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اس شائبہ سے بچنے کے لیے کیا گیا جو اللہ کے لیے بیوی ہونے کا شائبہ ہوسکتا تھا۔ کیونکہ انسانی ذہن غیر شعوری طور پر اُدھر منتقل ہوسکتا تھا اور یہ انسانی ذہن کو بہت برا اور نامناسب محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ اب جو تثلیث عیسائیوں کے ہاں رائج ہے' وہ ہے ''باپ' بیٹا اور روح القدس'' کی تثلیث۔

شرک فی الذات کی دوسری صورتیں

شرک فی الذات کی جو دوسری صورتیں ہیں وہ فلسفیانہ مذاہب میں رائج رہی ہیں۔ فلسفیانہ مذاہب کی مکمل ترین اور نمایاں ترین مثالیں ہندوستان کے مذاہب ہیں۔ ہندومت اصل میں کوئی ایک مذہب نہیں ہے' بلکہ یہ بہت سے مذاہب کا مجموعہ ہے۔ ان میں وہ مذاہب بھی ہیں جو خدا کا سرے سے انکار کرتے ہیں' وہ مذاہب بھی ہیں جو شدید ترین شرک کے اندر مبتلا ہیں' اور ان کے برعکس ان میں وہ مذاہب بھی ہیں جو توحید کی بہت اونچی چوٹی پر فائز ہیں۔ اسی طرح بدھ مت بھی بظاہر احوال جیسا بھی نظر

آ تا ہے' ایک فلسفیانہ مذہب ہے۔ جین مت بھی ایک فلسفیانہ مذہب ہے۔ تاؤازم اور کنفیوشسزم بھی فلسفیانہ مذاہب ہیں۔ اسی طرح یہ جو ہند چینی (Indo Chinese) مذاہب ہیں' ان سب کی بنیاد فلسفہ ہے۔ اگرچہ ہم یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتے' لیکن گوتم بدھ کے بارے میں بعض محققین کا گمان ہے کہ وہ ذوالکفل تھے' کپل وستو والے' یعنی کپل کا ''پ'' ، ''ف'' سے بدل گیا تو ذوالکفل ہو گیا (واللہ اعلم)۔ بہرحال ان فلسفیانہ مذاہب میں شرک کی جو یہ دو صورتیں اور شکلیں بنیں ان کو جان لیجیے۔

ایک شکل وہ ہے جسے انگریزی میں Pantheism سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فارسی میں اس کا ترجمہ ''ہمہ اوست'' ہے' اگرچہ اس کو خلطِ مبحث کیا جاتا ہے عقیدہ ''وحدت الوجود'' سے' جو ہمارے ہاں کے بعض حکماء' فلاسفہ اور صوفیاء کی اکثریت کا عقیدہ ہے۔ بعض لوگ نا سمجھی میں ''ہمہ اوست'' کو وحدت الوجود کے مترادف قرار دیتے ہیں یا وحدت الوجود کو ہمہ اوست کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

شرک فی الذات کی دوسری نمایاں شکل وہ ہے جسے انگریزی میں Incarnation اور ہندی میں ''اَوتار'' کا عقیدہ کہا جاتا ہے' اور عربی کا لفظ ''حلول'' تقریباً ان دونوں صورتوں کی تعبیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اب پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ ہمہ اوست یا Pantheism کیا ہے۔ یہ اصل میں فلسفۂ وجود کی ایک بحث ہے۔ ہندوستان میں بعض لوگ دو ہستیوں کو قدیم مانتے ہیں' یعنی خدا بھی قدیم اور مادہ بھی قدیم۔ ان کے خیال میں تخلیق کا عمل خدا اور مادے کے اشتراک سے وجود میں آتا ہے۔ جیسے ایک بڑھئی لکڑی سے کرسی یا میز یا منبر بنا دے' تو کرسی یا میز یا منبر بنانے والا بڑھئی بھی پہلے سے موجود تھا اور وہ لکڑی بھی پہلے سے موجود تھی جس سے یہ چیزیں بنائی گئیں۔ اسی طرح خدا بھی قدیم اور مادہ بھی قدیم ہے' اور خدا نے مادے سے یہ مختلف شکلیں بنا دیں۔ اس کو آپ ثنویت کہہ لیجیے کہ دو ہستیوں کو قدیم ماننا۔ اس کے علاوہ ایک عقیدہ اُن کا رہا جو تین اشیاء کو قدیم مانتے ہیں' یعنی خدا

بھی قدیم، مادہ بھی قدیم اور روح بھی قدیم۔ وہ خدا اور مادے کے ساتھ روح کو بھی قدیم مانتے ہیں کہ وہ بھی ہمیشہ سے ہے۔ یہ ''تعدّ دِقدماء'' کا عقیدہ ہے کہ قدیم ہستیاں ایک سے زائد دو یا تین مان لی گئیں اور یہ بھی ایک طرح کی تثلیث ہے۔ لیکن جو نسبتاً توحید کے ماننے والے تھے، جنہوں نے نہ روح کو قدیم مانا اور نہ مادے کو، بلکہ صرف خدا کو قدیم مانتے تھے، اب انہوں نے توحید سے شرک نکال لیا۔ ان کے لیے یہ بڑا اشکال پیدا ہوا کہ پھر خدا نے اس دنیا کو کیسے بنایا؟ اس لیے کہ جب کوئی شے پہلے سے تھی ہی نہیں اور صرف وہی قدیم ہے، یعنی نہ مادہ قدیم، نہ روح قدیم تو یہ دنیا کیسے وجود میں آ گئی؟ تو اس کی ایک شکل انہوں نے یہ قرار دی اور یہ عقیدہ وجود میں آیا کہ خدا نے خود ہی اس کائنات کا روپ دھار لیا۔ جیسے برف پگھل کر پانی بن جائے تو اب برف ہی پانی ہے، یعنی برف ہی نے پانی کی شکل اختیار کر لی۔ اب اس پانی کو آپ نے آگ دی تو وہ بھاپ بن گیا۔ تو اب یہ بھاپ ہی پانی ہے اور بھاپ ہی برف ہے۔ اسی طرح اُن کے خیال میں خدا نے کلیتًا یا جزواً اس کائنات کی شکل اختیار کر لی۔ اب اس عقیدے کی بھی دو شکلیں ہو گئیں۔ ایک یہ کہ خدا اب رہا ہی نہیں، بلکہ خدا کُل کا کُل اس کائنات کی شکل میں ڈھل گیا ہے، اب علیحدہ سے خدا کے نام سے کوئی شے نہیں۔ اور دوسری شکل یہ کہ خدا کے کسی جزو نے اس کائنات کی شکل اختیار کر لی۔ یعنی اگرچہ خدا بھی موجود ہے، لیکن یہ کائنات بھی اس کا جزو ہے، یا یہ اسی کے جزو کی ایک شکل ہے۔ ہندوؤں کے ہاں یہ تصورات ہیں کہ نعوذ باللہ خدا کے سر سے برہمن پیدا ہوئے، بازوؤں سے کھشتری پیدا ہوئے جو لڑنے والے ہیں، اور اس کے پاؤں سے شودر پیدا ہوئے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ تصورات اسی عقیدے کا ایک منطقی ربط ہیں۔ اس عقیدے کے فلسفیانہ پہلو پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب ہر چیز الوہیت کی حامل ہے۔ اس لیے کہ جب خدا ہی نے کائنات کا روپ دھار لیا ہے تو پھر درخت بھی خدا ہیں، سورج بھی خدا ہے، چاند بھی خدا ہے، کیڑے مکوڑے بھی خدا ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ معلوم ہوا کہ یہ بدترین شرک ہے جو آپ کو ہندوستان کی سرزمین میں ملے گا۔

صرف خدا کو قدیم ماننے والوں میں سے بعض نے اس طرح پیدا شدہ اشکال کے ازالے کے لیے ایک دوسری شکل یہ اختیار کی کہ خدا انسانوں کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے' یعنی کسی ایک انسان میں حلول کر جاتا ہے۔ یہ اَوتار یا Incarnation کا عقیدہ ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک رام چندر جی اور کرشن جی خدا کے اوتار ہیں۔ ان کے ہاں نو اَوتار تھے۔ ایک دسواں اوتار اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں نے ان میں شامل کر لیا ہے' جس کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔ بہرحال ہمہ اوست (Pantheism) اور اَوتار بن جانے یا حلول کر جانے (Incarnation) کا عقیدہ شرک فی الذات کی وہ صورت ہے جو فلسفیانہ مذاہب میں رائج ہے۔

اُمتِ محمدیہؐ پر خصوصی فضل وکرم

اب ان تمام چیزوں کو سامنے رکھ کر ہم اُمت مسلمہ کا جائزہ لیں کہ اس نوع کا شرک ہمارے ہاں آیا یا نہیں۔ اور اگر آیا تو کس سطح پر اور کس حد تک۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں' اور میرا گہرا احساس ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس اُمت پر بڑا فضل اور کرم ہوا کہ چودہ سو برس بیت جانے کے باوجود اس نوع کا کوئی عقیدہ مسلمانوں کے کسی بھی مستند فرقے کے مستند عقائد کی فہرست میں موجود نہیں ہے۔ یہ اللہ کا بڑا فضل اور ایک قسم کا معجزہ ہے۔ حالانکہ اس اُمت کو جو عقیدت اور محبت رہی ہے اپنے رسول ﷺ سے اس کا پاسنگ بھی نہیں ہے وہ محبت اور عقیدت اور وہ جاں نثاری جو کسی دوسرے رسول کے اُمتیوں کو اپنے رسول کے ساتھ ہے۔ اس کے باوجود نبی اکرم ﷺ کو خدا کا بیٹا یا خدا نہیں بنایا گیا۔ عوام کالانعام کے ہاں' واعظوں اور نعت گوؤں کے ہاں اور اُن شاعروں کے ہاں جو ﴿فِیۡ کُلِّ وَادٍ یَّہِیۡمُوۡنَ﴾ کا نقشہ پیش کر رہے ہوں' اس قسم کے اشارات اور کنائے مل جاتے ہیں اور یہ صرف ایہام کی حد تک ہے۔ ''ایہام'' کا مطلب ہے کہ بات صاف اور واضح نہ کی جائے کہ جس پر گرفت ہو' لیکن یہ کہ سامع کے ذہن میں ایک وہم اور ایک خیال ابھار دیا جائے۔ اس نوعیت کی باتیں شاعروں' واعظوں اور نعت گوؤں نے کی ہیں جن کے شرکیہ ہونے میں

کوئی شک نہیں ہے۔ مثلاً یہ شعر کہ:۔

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفےؐ ہو کر

اب آپ دیکھئے کہ اس میں اور اوتار کے عقیدے میں کیا فرق ہے؟ لیکن ذہن میں رکھیے کہ یہ ایک شاعر کی مبالغہ آرائی ہے۔ یہ اس درجے کی چیزیں اور اس طرح کے استعارے ہیں جن سے شاعری کی دکان چلتی ہے۔ اس طرح کا ایک اور شعر سننے کو ملا:۔

مدینے کی مسجد میں منبر کے اوپر
بغیر عین کا اِک عرب ہم نے دیکھا!

اب لفظ ''عرب'' میں سے ''عین'' نکال دیجیے تو ''رب'' رہ جائے گا۔ یعنی رسولِ عربیﷺ اصل میں ربّ ہیں۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ شعر میں بات واضح نہیں کی گئی اور آپ گرفت کریں گے تو کہا جائے گا ہم نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔ لیکن یہ کہ ایک وہم اور خیال پیدا کر دیا' ذہن کو اُدھر موڑ دیا' اور سننے والوں میں جو زیادہ خوش عقیدہ ہوں گے انہوں نے واہ واہ کی ہو گی اور داد دی ہو گی۔ تو اس طرح کی باتیں جہلاء اور عوام کالانعام کے تحت الشعور کے اندر پروان چڑھتی چلی گئی ہیں' لیکن ہمارے ہاں کے مستند فرقوں کے مستند عقائد میں کسی جگہ بھی کوئی ایسا شائبہ یا اشارہ تک نہیں ہے۔ اور یہ میرے نزدیک معجزہ ہے محمدٌ رسول اللہﷺ کا اور اصل میں اس کا براہِ راست تعلق ہے ختمِ نبوت کے ساتھ۔ دراصل یہ تحفظ ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمﷺ کو عطا فرمایا کہ آپؐ اس غلو کا ہدف اور نشانہ نہیں بنے۔ یہ ختم نبوت کے لوازم میں سے ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا خود ذمہ لیا' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ (الحجر) ''یقیناً ہم نے ہی یہ الذکر (قرآن حکیم) نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ اور دوسری طرف محمدٌ رسول اللہﷺ کو حفاظت عطا فرمائی کہ ان کی شخصیت مسخ نہ ہو جائے' وہ کہیں اَوتار نہ بنا دیے جائیں' وہ بھی کہیں خداؤں کی فہرست میں شامل نہ ہو جائیں' انہیں کہیں

خدا کا بیٹا نہ بنا دیا جائے۔ تو یہ درحقیقت ایک تحفظ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیؐ اکرم ﷺ پر ہوا ہے۔ اس کا زیادہ اندازہ آپ کو اُس وقت ہوگا جب آپ اس حقیقت کو سامنے رکھیں گے کہ یہ معاملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہوا ہے۔

حضرت علیؓ کی نسبت نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ایک اُمتی کی ہے' چنانچہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ سے کم از کم ایک درجہ تو نیچے لائیں گے۔ ویسے تو اہل سنت کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کے بعد درجہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے' پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہے اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے۔ لیکن اُمتیوں کو ایک ہی کیٹیگری شمار کرنے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے کم از کم ایک درجہ تو نیچے ہیں' لیکن آپ سوچیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کہنے والے پیدا ہو گئے' اور خدا کا بیٹا بھی نہیں بلکہ خود انہیں خدا بنا دیا گیا۔ بہت سے لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بدترین عقیدے کی پاداش میں زندہ آگ میں جلوایا ہے۔ یہ ایک یہودی سازش تھی اور اس سازش کو کامیاب کرنے کے لیے لوگوں نے پورے استقلال کے ساتھ جانیں دی ہیں۔ اس لیے کہ قربانی دیے بغیر کسی بھی سازش کی آگ آگے نہیں بڑھتی۔ ہمارے ہاں جہلاء میں جو نعرہ مروّج ہے وہ ''یاعلی مدد'' کا ہے ''یامحمدؐ مدد'' کا نہیں ہے۔ ''یامحمد''/''یارسول اللہ'' تو محض اپنے تشخص کو نمایاں کرنے کے لیے مسجدوں میں لکھنے کے کام آتا ہے' یا یہ نعرہ ایک خاص فرقے کے اجتماع یا جلسہ کے اندر لگوایا جاتا ہے' تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ مسجد فلاں فرقے کی ہے اور یہ جلسہ فلاں گروہ کا ہے۔ باقی یہ کہ جو نعرہ میدان میں لگتا ہے وہ ''یامحمدؐ مدد'' کا نہیں' بلکہ ''یاعلی مدد'' کا ہوتا ہے۔ تو الوہیت کا یہ معاملہ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ ہوا تھا' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہوا۔

مسند احمد میں یہ حدیث موجود ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک مشابہت پائی جاتی ہے کہ (ایک طرف) اُن سے یہود نے بغض رکھا حتیٰ کہ ان کی والدہ محترمہ پر

(بدکاری کی) تہمت لگائی' اور (دوسری طرف) نصاریٰ نے ان سے انتہائی محبت کی' حتیٰ کہ انہیں اس مقام پر پہنچا دیا جو اُن کا مقام نہیں۔'' یہ دو انتہائیں ہیں۔ ایک گروہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عقیدت میں اس قدر غالی ہو گیا کہ اس نے انہیں خدا کا بیٹا بنا دیا اور ایک گروہ اُن کی دشمنی میں اس انتہا کو پہنچا کہ انہیں (معاذ اللہ) ولد الزنا قرار دیا اور اپنے بس پڑتے انہیں سولی پر چڑھا کر دم لیا۔ بعینہٖ یہی معاملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہو کر رہا کہ حضرت علیؓ کو خدا کہنے والے بھی پیدا ہوئے اور خوارج کا وہ فرقہ بھی پیدا ہوا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو (نعوذ باللہ) کافر اور واجب القتل کہتا تھا اور انہی میں سے ایک فرد نے بالآخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔

اب آپ اس پس منظر میں دیکھئے کہ الحمد للہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ تو خدا کا بیٹا کہا گیا اور نہ ہی خدا کہا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کا خصوصی تحفظ ہے کہ اس نوع کا کوئی بھی خیال ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوا۔ بدقسمتی سے شاعری اور نعت گوئی کی حد تک ایسی حرکات سرزد ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ نعت کہتے ہوئے حدود کے اندر رہنا اکثر و بیشتر بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کسی شاعر نے بالکل صحیح بات کہی ہے ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

چنانچہ نعت گوئی میں کچھ عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے' ہوش کا دامن ہاتھ میں رہتا نہیں۔ ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ بڑے سے بڑے ممدوح شخص کی ممدوحیت بھی حق کو تسلیم کرنے میں اور باطل کے ابطال میں ہمارے سامنے مانع نہ ہو اور راستے کا روڑا نہ بنے۔ معصوم صرف نبی ہوتے ہیں اور نبوت ختم ہو گئی محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ اپنی ذات میں حجت تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔ باقی سب کو تو پرکھا جائے گا قرآن اور حدیث کی کسوٹی پر۔ جو اِس پر صحیح اترے وہ صحیح ہے۔ کسی بھی شخص کو ہم یہ درجہ نہیں دے سکتے کہ وہ جو چاہے کہہ دے ہم اسے تسلیم کر لیں گے' بلکہ اس کی جو بات صحیح ہے وہ تسلیم کریں گے اور جو غلط ہے اس کو ردّ کر دیں گے۔ کسے باشد' کوئی بڑی سے بڑی ممدوح شخصیت ہی

کیوں نہ ہو۔

بہرحال ہمارے ہاں شاعری اور نعت گوئی کی حد تک اَوتار کے عقیدے کے خیالات موجود ہیں اور صفاتِ الٰہی میں نبی اکرم ﷺ کو اللہ کا ہم پلہ بنا دیا گیا ہے—— یہ بحث ان شاءاللہ ''شرک فی الصفات'' کے ذیل میں تفصیل سے آئے گی—— لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا' آپ کو مسلمانوں کے کسی بھی مستند فرقے کے مستند علماء کے ہاں ایسی چیز نہیں ملے گی۔ اہل علم جب بات کریں گے تو ان کی بات کے اندر توازن ہوگا' اور وہ ان علمی احتیاطوں کو ملحوظ رکھ کر بات کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر انسان ذرا سا بھی غیر محتاط ہو جائے تو وہ شرک کے دامن میں جا پہنچتا ہے۔

اسی طرح جب وحدت الوجود کا عقیدہ ہمارے ہاں شعراء کا تختۂ مشق بن گیا تو اس کی بھی جو تعبیریں عوام تک پہنچی ہیں وہ ہمہ اوست اور اَوتار والی ہیں۔ ہمہ اوست کی تعبیر ہمارے ہاں اس شعر میں ملتی ہے: ؎

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ
خود رندِ سبو کش
خود برسرِ آں کوزہ خریدار بیامد
بشکست و رواں شد

برتن بنانے والا مٹی لے کر اس کو چکر پر چڑھاتا ہے تو ایک نئی چیز یعنی برتن وجود میں آ جاتا ہے۔ اب ویسے تو یہ تین چیزیں ہو گئیں۔ ایک خود برتن بنانے والا' دوسرا وہ برتن یا کوزہ اور تیسری چیز وہ مٹی یا گارا جس سے برتن وجود میں آیا۔ لیکن اس شعر کی رو سے اصل میں یہ تین نہیں ہیں' بلکہ ایک ہی ہے۔ اب وہ برتن بنانے والا خود ہی اس کوزے میں شراب بھی پی رہا ہے۔ پھر خود ہی اس نے خریدار بن کر اس کو خریدا' اور پھر اس کو توڑا اور آگے بڑھ گیا۔ یہ جو سارا تماشا ہے یہ اُس ہمہ اوست کی تعبیر ہے۔ ویسے یہ شاعری اتنی بلند ہے' ترکیبیں اتنی چست اور آہنگ ایسا دلکش ہے کہ آدمی جھوم جاتا ہے۔ اگلے شعر میں یہاں تک کہا گیا: ؎

در برقعۂ جبریل بود نازلِ قرآں
آں چشمۂ وحدت
آخر بہ جہاں صورتِ آں یار برآمد
محبوبِ جہاں شد!

یعنی جبرئیل کا لبادہ بھی اُس نے خود ہی اوڑھا' قرآن کا نازل کرنے والا بھی وہ خود ہے اور آخر کار نبی اکرمﷺ کی شکل میں وہ (خدا) دنیا میں خود ہی آ گیا' اور محبوب جہاں بن گیا۔(اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَـیْہِ رَاجِعُوْنَ!)

اب دیکھئے اس میں ہمہ اوست اور اوتار دونوں طرح کے تصورات جمع ہیں۔ شاعری اگرچہ بہت پیاری اور وجد میں لانے والی ہے' لیکن بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی !اسی لیے کسی نے بڑی پیاری بات کہی ہے :''با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار!'' یعنی آپ اللہ کی جتنی تعریف کرسکیں کرتے چلے جائیں' تب بھی آپ اس کی تعریف کا حق ادا نہیں کر سکتے ۔لیکن حضرت محمدﷺ کی تعریف کرتے ہوئے بہت محتاط اور چوکس رہنا پڑے گا۔کسی انسان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی معرفت کا حق ادا کر سکے۔اس ضمن میں لامحالہ یہی کہنا پڑے گا:

مَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَمَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ

''اے ربّ! ہم نے تیری بندگی نہیں کی جتنا کہ تیری بندگی کا حق تھا اور تیری معرفت حاصل نہیں کر سکے جتنا کہ اس کا حق تھا۔''

نبی اکرمﷺ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز میدانِ حشر میں' جب دربارِ خداوندی لگا ہوگا' حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا اور میں اُس روز اپنے ربّ کی وہ حمد کروں گا جو آج نہیں کرسکتا۔اس لیے کہ حمد ہوتی ہے معرفت کی نسبت سے اور معرفت نبویؐ کسی ایک جگہ آ کر ٹھہر نہیں گئی' بلکہ اس میں ترقی ہوتی رہی' درجات بلند سے بلندتر ہوتے رہے۔ازروئے الفاظِ قرآنی:﴿وَلَـلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰیؕ﴾ (الضحٰی) ''اور ہر آنے والی ساعت آپ کے لیے ہر پہلی ساعت سے بہتر ہے''۔تو جیسے جیسے

معرفتِ خداوندی کی منازل طے ہو رہی ہیں حمد کے درجات بھی بلند ہو رہے ہیں۔ جتنا آپ ربّ کو پہچانیں گے اتنی ہی اس کی حمد کرسکیں گے! چنانچہ آپ اللہ تعالیٰ کی جتنی حمد بھی کرلیں، پھر بھی اس کی حمد ادا نہیں ہوتی، ع ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کے معاملے میں انتہائی ہوشیار رہنا ہوگا۔ ع ''ہشدار کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را!'' کے مصداق یہاں انسان کا قدم تلوار کی دھار پر ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿**لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ**﴾ (النساء: ۱۷۱) ''اپنے دین میں غلو ہرگز نہ کرو''۔ یہ غلو ہی تو تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا گیا' حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا گیا۔ یہ محبت اور عقیدت کا غلو ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی مدح' تعریف اور ثناء کے بیان میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جہلاء اور عوام کالانعام سے قطع نظر ہمارے ہاں کے مستند فرقوں کے مستند عقائد میں الحمد للہ اس احتیاط کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

شخصیتِ محمدیؐ کے تحفظ کے اسباب

اس ضمن میں باطنی طور پر تو اصل دخل ہے حکمت خداوندی کو کہ یہ تحفظِ خصوصی ہے جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہوا' لیکن اس میں دو چیزیں اور ہیں جو ظاہری اسباب میں سے ہیں۔ جیسے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی حفاظت کا اصل سبب تو ہے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اللہ تعالیٰ کا ذمہ' لیکن ظاہری اسباب میں یہ حفظِ قرآن کا جو معاملہ چلا' یہ اس کا ذریعہ ہے۔ یہ قرآن صرف کتابوں ہی میں نہیں ہے' ﴿**بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ**ؕ﴾ (العنکبوت: ۴۹) ''بلکہ یہ کھلم کھلا آیات ہیں جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں''۔ فن قراءت کی کتابیں تو بعد میں لکھی گئی ہیں۔ قرآن حکیم تو ایک زبان نے دوسری زبان سے سیکھا ہے' اور یہ ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہوا ہے' اور اب لاکھوں کی تعداد میں حفاظِ کرام موجود ہیں۔ پھر رمضان المبارک اور تراویح کا نظام ہے جس میں حفظ کو تازہ کیا جاتا ہے۔ تو یہ سارا سلسلہ حفاظتِ قرآن مجید کے ظاہری اسباب میں سے ہے' جس کے باطن میں دراصل مشیتِ خداوندی کارفرما ہے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کو جو تحفظ ملا ہے کہ آپؐ کے ساتھ وہ ظلم روا نہیں

رکھا گیا' درآں حالیکہ آپؐ کے ایک اُمتی پر وہ ظلم ہو گیا' تو اصل میں تو یہ مشیتِ الٰہی ہے' لیکن اس کے ظاہری اسباب میں سے پہلا سبب یہ ہے کہ قرآن نے نبی اکرمﷺ کی بشریت کو بہت نمایاں کیا ہے۔ قرآن کریم میں جا بجا یہ مضمون مختلف پیراؤں میں آیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا:

﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ﴾

(الکھف: ۱۱۰)

''(اے نبیؐ!) کہیے کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا' میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے''۔

سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف' جو دو جڑواں سورتیں ہیں' ان میں اہل علم کے لیے ایک عجیب نکتہ ہے کہ ان دونوں کی آخری دو دو آیات فعل امر ''قُل'' سے شروع ہوتی ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان ہے۔ فرمایا:

﴿وَقُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ یَکُنۡ لَّـہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَلَمۡ یَکُنۡ لَّـہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرۡہُ تَکۡبِیۡرًا﴿۱۱۱﴾﴾

''اور (اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا' نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے اور نہ وہ کمزور ہے کہ کوئی اس کا دوست ہو' اور اس کی بڑائی بیان کرو کمال درجے کی بڑائی''۔

اِس مقام پر اللہ تعالیٰ کی شانِ تنزیہی کو خوب نمایاں کیا گیا ہے' مبادا کہیں اللہ تعالیٰ کو اُس کے مقامِ بلند سے گرا دیا جائے۔

اس لیے کہ شرک کی دو ہی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اُس کے مقامِ رفیع سے گرا کر مخلوقات کی صف میں لا کھڑا کیا جائے اور دوسری صورت یہ کہ مخلوقات میں سے کسی کو اٹھا کر خدا کے برابر بٹھا دیا جائے۔ ان کے علاوہ تیسری صورت تو ممکن نہیں۔ تو سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت نے شرک کی پہلی صورت کی جڑ کاٹی ہے' جبکہ دوسری صورت کی جڑ کاٹی ہے سورۃ الکہف کی آخری آیت نے بایں الفاظ: ﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ﴾ (الکھف: ۱۱۰)

یہی مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں ایک اور جگہ بھی آیا ہے۔ جب مشرکین عرب نے نبی اکرمﷺ سے معجزات طلب کیے کہ اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہمارے لیے فوراً ہی یہاں پر ایک چشمہ برآمد ہو جائے‘ یا ایک باغ تیار ہو جائے‘ یا ایک محل بن جائے‘ یا ہمیں آسمان پر چڑھ کر دکھائیں‘ تو ان سب باتوں کا یہ جواب دلوایا گیا: ﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴿۹۳﴾﴾ ’’(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے پاک ہے میرا پروردگار‘ میں تو صرف ایک انسان ہوں‘ جسے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے‘‘۔ تم یہ مطالبے مجھ سے تب کرتے اگر میں نے خدائی کا دعویٰ کیا ہوتا۔ میں نے خدائی کا دعویٰ تو نہیں کیا۔ ثبوت اور دلیل طلب کی جاتی ہے دعوے کی مناسبت سے۔ اگر میں نے الوہیت اور خدائی کا دعویٰ کیا ہوتا تو تمہارے مطالبے درست تھے کہ یہ کر کے دکھاؤ تو تمہیں خدا مانیں گے‘ جبکہ میں نے تو صرف ایک دعویٰ کیا ہے کہ میں ایک رسولِ بشر ہوں‘ لہٰذا مجھ سے اسی کی مناسبت سے کوئی دلیل طلب کرو۔ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن مجید نے نبی اکرمﷺ کی بشریت کو بہت نمایاں کیا ہے۔

یہاں میں ایک واقعہ پیش کر دوں کہ ایک بار بریلوی مکتبِ فکر کے ممتاز عالم دین صاحبزادہ فیض الحسن صاحب نے اپنی تقریر میں اپنے مخالفین پر بڑے لطیف پیرائے میں تنقید کی‘ جو مجھے پسند آئی۔ انہوں نے اپنے ہم مسلک اور ہم مشرب لوگوں کے سامنے مخالفین کو للکار کر کہا کہ: ’’کیا تم ہمیں پاگل اور جاہل سمجھتے ہو؟ کیا ہم قرآن نہیں پڑھے ہوئے یا ہم عربی نہیں جانتے؟ ہم خوب جانتے ہیں کہ قرآن نے نبی اکرمﷺ کو بشر کہا ہے۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ تم آپﷺ کی بشریت کو زیادہ نمایاں نہ کرو‘ بشر بشر کی رٹ نہ لگاؤ کہ یہ سوئے ادب ہے۔ اس لیے کہ تمہارے والد کا نام اگر عبدالرحمٰن ہے تو تم اسے عبدالرحمٰن کہہ کر نہیں پکارتے‘ ابا جان کہتے ہو!‘‘ بہرحال قرآن مجید جس طرح سے نبیٔ اکرمﷺ کی بشریت کو نمایاں کر رہا ہے تو یہ کسی حکمت کی وجہ سے ہے۔ **فِعْلُ الْحَكِيْمِ لَا يَخْلُوْ عَنِ الْحِكْمَةِ** کے مصداق لازماً اس کی کوئی ضرورت ہے‘ لازماً کوئی فتنہ ہے جس کا سدّ باب مقصود ہے۔ چنانچہ اس مقصد اور حکمت کے تحت اس کو

بیان کرنا ہوگا۔ البتہ ضدّ م ضدّ ا کا معاملہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

میں آپ کو اسی ضدّ م ضدّ ا کی مثال کے طور پر نام لیے بغیر ایک دوسرے مکتب فکر کے ایک بہت بڑے عالم دین کا واقعہ سناتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے! جس کی مجھے تحسین کرنی تھی اس کا نام لے کر بات کی ہے اور جس پر تنقید کرنی ہے اس کا نام نہیں لینا چاہتا۔ وہ صاحب پنجابی میں سیرت النبیﷺ پر ملی جلی تقریر کر رہے تھے‘ جس میں تفسیر بھی تھی‘ سیرت بھی تھی اور اختلافی مسائل بھی تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس اللہ کے بندے نے پوری تقریر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے نام کے ساتھ کہیں بھی ’’حضرت‘‘ اور ’’رضی اللہ عنہ‘‘ نہیں کہا۔ اور جب بیعت رضوان کا واقعہ سنایا تو اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں انہوں نے کہا: (اردو ترجمہ) ’’ارے! عثمان زندہ ہے اور اِدھر بیعت ہو رہی ہے! تو کہاں گیا تمہارا علم الغیب؟‘‘ یہ آگ کو ہوا دینے کا سا ایک انداز ہے اور ایک رسہ کشی کا معاملہ ہے۔ ورنہ یہ کہ ان معاملات کو ہم حل کرنے پر آئیں تو قطعاً کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ جو تحفظ ہوا ہے رسول اللہﷺ کا اس میں بہت بڑا حصہ اس کا ہے کہ قرآن نے نبی اکرمﷺ کی بشریت کو بہت نمایاں کیا ہے۔

اسی کے تابع دوسری بات سمجھ لیجیے کہ نبی اکرمﷺ نے بھی اپنی بشریت کو بہت نمایاں کیا ہے۔ اگر کہیں ذرا سا بھی وہم پیدا ہونے کا امکان نظر آیا تو وہاں پر بھی نبئ اکرمﷺ نے فوراً ٹوک دیا۔ مثلاً تعظیماً کھڑے ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ کوئی بزرگ ہستی آئے تو آپ کھڑے ہو جاتے ہیں‘ یہ اس کی تعظیم ہے۔ لیکن نبی اکرمﷺ نے اپنے لیے اسے بھی پسند نہیں کیا‘ بلکہ آپؐ صحابہؓ کو اس سے سختی سے روکتے تھے۔ ایک صحابیؓ کی زبان سے گفتگو میں یہ الفاظ نکل گئے: ’’**مَا شَآءَ اللّٰہُ وَمَا شِئْتَ**‘‘ یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپؐ چاہیں۔ اس پر آپؐ نے فوراً ٹوک دیا: ((**اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰہِ نِدًّا؟**)) ’’کیا تم نے مجھے اللہ کا مدّ مقابل بنا دیا؟‘‘ یہاں آپؐ نے ’’نِدّ‘‘ کا لفظ استعمال کیا جس کی جمع ’’اَنداد‘‘ ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿**وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ**

مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ﴾ (البقرۃ:۱٦۵) ’’اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اُس کے مدّ مقابل بنا تا ہے‘ اور پھر یہ لوگ ان سے اللہ کی محبت جیسی محبت کرتے ہیں‘‘۔ تو نبی اکرم ﷺ نے اتنا سخت لفظ استعمال کیا کہ تم نے مجھے اللہ کا نِدّ (مدمقابل) بنا دیا؟ حالانکہ ظاہر ہے کہ ان صحابیؓ کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن چونکہ اُن کا یہ جملہ وہم پیدا کر سکتا تھا اور مساوات کی شکل ذہن میں آ سکتی تھی‘ لہٰذا آپؐ نے سختی سے ٹوک دیا۔ اس لیے کہ مشیت تو صرف اللہ کی ہے۔ آپ ﷺ کی شان تو یہ ہے کہ: ﴿اِنَّکَ لَا تَہۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَ لٰـکِنَّ اللّٰہَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ﴾ (القصص:۵٦) ’’(اے نبیؐ!) آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو چاہیں (یہ آپ کے اختیار میں نہیں ہے)‘ بلکہ اللہ ہی ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے‘‘۔

تیسری بات جو مَیں کرنے لگا ہوں وہ ذرا حساس (sensitive) بحث ہے۔ قرآن مجید میں نہ صرف نبی اکرم ﷺ کی بشریت کو نمایاں کیا گیا بلکہ اگر کہیں آپؐ سے بتقاضائے طبع بشری معمولی سی خطا یا چوک بھی ہوئی (ایسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے بھی زبان دکھتی ہے) تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ٹوکا اور گرفت فرمائی اور اس گرفت کو ہمیشہ ہمیش کے لیے قرآن مجید کا جزو بنا دیا‘ تاکہ تمام کلمہ گو‘ تمام اُمتی ہمیشہ پڑھتے رہیں کہ یہ گرفت ہوئی تھی محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی۔ چنانچہ سورۂ عبس میں ارشاد ہوا:

﴿عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ۙ﴿۱﴾ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ﴿۲﴾ وَ مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ۙ﴿۳﴾ اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَہُ الذِّکۡرٰی ؕ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی ۙ﴿۵﴾ فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی ؕ﴿۶﴾ وَ مَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ؕ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنۡ جَآءَکَ یَسۡعٰی ۙ﴿۸﴾ وَ ہُوَ یَخۡشٰی ۙ﴿۹﴾ فَاَنۡتَ عَنۡہُ تَلَہّٰی ﴿ۚ۱۰﴾ کَلَّاۤ اِنَّہَا تَذۡکِرَۃٌ ﴿ۚ۱۱﴾ فَمَنۡ شَآءَ ذَکَرَہٗ ﴿ۘ۱۲﴾﴾

’’تیوری چڑھائی اور منہ موڑ لیا‘ اس لیے کہ ان کے پاس آیا ایک اندھا۔ آپ کو کیا معلوم شاید کہ وہ تزکیۂ نفس حاصل کرتا یا وہ نصیحت اخذ کرتا تو نصیحت اسے فائدہ پہنچاتی۔ جو شانِ استغناء کا مظاہرہ کر رہا ہے اس کی طرف آپ توجہ کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ تزکیہ حاصل نہ کرے تو آپ پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو آپ کے پاس دوڑ کر آیا اور اس کے اندر خشیت ہے تو آپ اس سے

بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ ہرگز نہیں‘ یہ تو ایک یاددہانی ہے۔ پس جو چاہے اس یاددہانی کو اخذ کرے‘‘۔

اسی طرح غزوۂ اُحد کا واقعہ ذہن میں لائیے جس پر رسول اللہﷺ کی گرفت ہوئی‘ حالانکہ آپﷺ میں وہ پہاڑ جیسی عزیمت تھی کہ کوہ ہمالیہ بھی جس پر رشک کرے۔ یومِ طائف میں یہ عزیمتِ محمدیؐ خوب ظاہر ہوتی ہے۔ پتھراؤ سے جسم لہولہان ہے‘ زید بن حارثہؓ کے سوا کوئی جاں نثار ساتھ نہیں ہے۔ اندازہ کیجیے کہ سائے کی طرح آپؐ کے ساتھ رہنے والے حضرت ابوبکرؓ بھی سفر طائف میں آپؐ کے ہمراہ نہیں تھے۔ آپؐ کا استہزاء ہوا‘ فقرے چست کیے گئے‘ طائف کے تینوں رؤسا نے ایک سے ایک بڑھ کر کلیجے کو چھید دینے والے الفاظ استعمال کیے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اوباشوں نے جس طرح آپؐ کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا وہ ناقابل بیان ہے۔ لیکن اُس وقت بھی جبکہ آپؐ کو اختیار دیا گیا کہ اگر آپؐ چاہیں تو مَلَک الجبال ان دونوں پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دے اور طائف کے رہنے والے ان کے مابین سرمہ بن جائیں‘ وہ عزیمتِ محمدیؐ کوئی بددعائیہ کلمہ زبان سے نکالنے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ بلکہ زبانِ رحمت سے ارشاد ہوا کہ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت دے دے! لیکن غزوۂ اُحد میں زبان سے یہ جملہ نکل گیا: ((کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْمًا خَضَبُوْا وَجْہَ نَبِیِّھِمْ بِالدَّمِ؟)) ’’اُس قوم کو اللہ کیسے ہدایت دے گا جس نے اپنے نبی کے چہرے کو خون سے رنگ دیا!‘‘ حالانکہ یہ کوئی بددعا نہیں تھی کہ اے اللہ! ان کو ہدایت نہ دیجیو‘ بلکہ یہ ایک تبصرہ تھا۔ لیکن اس پر گرفت ہوگئی: ﴿لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ اَوْ یُعَذِّبَھُمْ﴾ (آل عمران:۱۲۸) ’’(اے نبی!) آپ کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں ہے (ہدایت اور ضلالت کا سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے) وہ چاہے گا تو اُن کی توبہ قبول کرے گا اور اگر چاہے گا تو اُن پر عذاب بھیج دے گا‘‘۔ یہ فیصلہ اے نبیؐ! آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے‘ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ آپ اپنا کام کیجیے اور ان کے انجام کو ہمارے حوالے کیجیے۔ ﴿اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَھُمْ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَھُمْ ﴿۲۶﴾﴾ ’’یقیناً

ہماری طرف ان سب کولوٹ کر آنا ہے‘ پھر ہمارے ذمہ ہے ان کا حساب‘‘۔ اور تاریخ کی اس حقیقت کو دیکھئے کہ اس پورے حادثۂ فاجعہ کا جو سب سے زیادہ ذمہ دار شخص ہو سکتا تھا‘ یعنی خالد بن ولید‘ اسی کو اللہ تعالیٰ نے لسانِ محمدیؐ سے خطاب دلوایا: ((**خَالِدٌ سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ**)) ’’خالد تو اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے‘‘۔ عالمِ اسباب میں تو غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی فتح کو شکست میں بدل دینے والے خالد بن ولید ہی تھے‘ لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے جاں نثاروں میں شامل فرما دیا۔ بہرحال قرآن مجید نے ان باتوں کو نمایاں کیا ہے تو حکمتِ بالغہ کے تحت کیا ہے۔ ایسے مقامات سے گزرتے ہوئے قاری کے دل میں یہ بات آتی ہوگی کہ اگر یہ چیزیں قرآن میں نہ ہوتیں تو کیا حرج تھا۔ ہمیں ترجمہ کرتے ہوئے مشکل پیش آتی ہے اور ہماری زبان لڑکھڑاتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿**وَاِنْ کَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَکَ عَنِ الَّذِیْ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَہٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْکَ خَلِیْلًا ۝ وَلَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا ۝**﴾ (بنی اسرائیل)

’’اور (اے نبیؐ!) یہ لوگ تو درپے تھے اس کے کہ آپ کو بچلا دیں اس وحی سے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ آپ ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ لائیں‘ اور تب تو یہ لازماً آپ کو اپنا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم آپ کے پاؤں جمائے نہ رکھتے تو آپ تو ان کی طرف کسی درجے میں مائل ہو ہی جاتے۔‘‘

اور اگلی آیت میں پھر اس پر تبصرہ ہوا ہے:

﴿**اِذًا لَّاَذَقْنٰکَ ضِعْفَ الْحَیٰوۃِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا ۝**﴾

’’اگر ایسا ہو جاتا تو ہم لازماً آپ کو دوہری سزا دیتے دنیا کی اور دوہری سزا دیتے موت کی‘ پھر آپ کو ہمارے مقابلے میں اپنے لیے کوئی مددگار (اور کوئی چھڑانے والا) نہ ملتا‘‘۔

بہرحال بتانا یہ مقصود ہے کہ چودہ سو برس بیت جانے کے باوجود محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اُسی طرح شرک کی آمیزش سے پاک اور صاف ہے۔ آپؐ بشر ہیں اور رسول ہیں۔ آپؐ عبدہٗ بھی ہیں اور رسولہٗ بھی ہیں۔ آپؐ عبدِ کامل بھی ہیں اور رسولِ کامل بھی۔ اس شعر میں کتنی بڑی حقیقت بیان ہوئی ہے:

اَلرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلْ
وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی

''ربّ ربّ ہی ہے چاہے وہ کتنا ہی نزولِ اجلال فرمالے' اور بندہ بندہ ہی ہے خواہ وہ کتنا ہی بلند مقام پر پہنچ جائے''۔

چودہ سو برس گزرنے کے باوجود یہ امتیاز قائم ہے' حالانکہ اس اُمت میں اپنے نبی ﷺ کے ساتھ محبت اور عقیدت میں کسی زمانے میں کوئی کمی نہیں رہی ہے۔

بہرحال یہ حکمتِ خداوندی اور مشیتِ ایزدی کے تحت ہے' اور یہ لازمی نتیجہ ہے ختمِ نبوت کا۔ لیکن اس کے اسبابِ ظاہری میں سے پہلا یہ ہے کہ قرآن مجید نے نبیٔ اکرم ﷺ کی بشریت پر بہت زور دیا ہے اور اسے بہت نمایاں کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ ﷺ نے اگر کہیں صحابہ کرامؓ میں کوئی ایسا رجحان دیکھا کہ جس سے کسی دیکھنے والے کو مغالطہ ہوسکتا تھا تو اس پر آپؐ نے نکیر فرمائی۔ اور تیسرے یہ کہ جہاں کہیں بھی بر بنائے طبع بشری آپ ﷺ سے کوئی خطا یا چوک ہوتی تھی' اگرچہ وہ جانبِ خیر ہی ہوتی تھی' تو اُس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت گرفت ہوتی۔ یہاں میں کسی مغالطے کے سدّ باب کے لیے وضاحت کردوں کہ نبی کی غلطی کے لیے ''خطا'' کا لفظ موزوں ترین ہے۔ اس لیے کہ خطا میں نیت کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لفظ کا سب سے نمایاں استعمال ہے ''نشانے کا خطا ہوجانا''۔ اب نشانچی کی تو نشانہ لگانے کی انتہائی کوشش ہوتی ہے' اس کی نیت یہ نہیں ہوتی کہ نشانہ اِدھر اُدھر ہو' لیکن بعض اوقات نشانہ خطا ہو جاتا ہے۔ اور یہ اس کے ارادے اور نیت سے بالکل باہر کا معاملہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ خطا میں نفسانیت نہیں ہوتی بلکہ خیر ہی کی طلب ہوتی ہے۔ یعنی نبی سے خطا ہوتی ہے تو جانبِ خیر

میں ہوتی ہے' جانبِ شر میں نہیں ہوتی۔ سورۂ عبس کے واقعے کو پیش نظر رکھیے کہ یہ سارا معاملہ دین کی تبلیغ کے لیے تھا' دین کی اقامت کے لیے راستہ نکالنا مقصود تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے چاہا کہ ان چودھریوں اور سرداروں کی طرف توجہ اور التفات کروں گا تو ان میں سے اگر ایک بھی ایمان لے آتا ہے تو وہ ہزاروں کے برابر ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے جھولی پسار پسار کر دعا کی ہے کہ پروردگار! عمرو بن ہشام یا عمر بن الخطاب میں سے ایک کو تو ضرور اسلام کی توفیق عطا فرما دے! اس لیے کہ آپؐ جانتے تھے کہ ان میں سے ایک جو ہے وہ ایک لاکھ کے برابر ہے۔ ایک ایمان لے آئے گا تو دین کو تقویت پہنچے گی۔ تو یہ سارا معاملہ محض دین کے لیے تھا' اس سے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو (معاذ اللہ) کوئی اپنی ذاتی آسانی مطلوب نہیں تھی' کوئی اپنی ذاتی قدر و منزلت بڑھانی مقصود نہیں تھی۔ ان بڑوں کی طرف التفات اس لیے نہیں تھا کہ ان کی دولت کی طرف آپؐ کی کوئی حریصانہ نگاہ تھی' (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ) بلکہ یہ دین کی بہتری کے لیے اور ان مسلمانوں کی مصلحت کے لیے تھا جو چکی کے پاٹوں میں پسے ہوئے تھے۔ آپؐ نے چاہا کہ اگر ایسے چند با اثر لوگ ایمان لے آئیں تو ان کو بھی ریلیف ملے گا' انہیں بھی سہارا ملے گا' ان کو قوت اور تقویت حاصل ہوگی۔

بہر حال قرآن نے ان چیزوں کو جس طرح نمایاں کیا اور جو سخت اندازِ خطاب برتا ہے یہ درحقیقت اس وجہ سے ہے کہ مقامِ ربوبیت اور مقامِ عبدیت میں امتیاز قائم رہے۔ اور یہ صورت حال الحمد للہ' ثم الحمد للہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود برقرار رہی ہے۔ باقی یہ کہ ہمارے ہاں اگر کچھ اولیاء اللہ اور صوفیاء کی عقیدت میں کچھ غلو ہوا ہے تو جان لیجیے کہ ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' کے مصداق اگر محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا مقام یہ ہے جو قرآن نے بیان فرمایا تو کسی اور کا ان سے اونچا مقام کیونکر ہو جائے گا؟ کسے باشد! بڑے سے بڑے پیر' بڑے سے بڑے صوفیاء اور بڑے سے بڑے اولیاء اللہ کا مقام بھی محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایسے ہے جیسے سورج کے سامنے ستارے ہوں' ان سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہمارے ہاں جو مغالطے

پھیلے ہوئے ہیں وہ محض اسی نوعیت کے ہیں جیسے میں نے بتایا، کہ جہلاءِ شعراءِ نعت گوؤں اور واعظوں نے اپنے غلوِ بیان میں یہ شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ بدقسمتی سے اس میں اَوتار (Incarnation) کا عقیدہ بھی آ گیا ہے اور ہمہ اوست (Pantheism) بھی آ گیا ہے اور اس میں ''بغیر عین کے اِک عرب'' سے خدا کا ایہام بھی پیدا کر دیا گیا ہے۔ آپ ان ساری چیزوں کو اسی کھاتے میں رکھیے اور اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ چودہ سو برس بیت جانے کے باوجود بھی اس اُمت مسلمہ کے کسی بھی مستند فرقے کے مستند عقائد کی فہرست میں ''شرک فی الذات'' کی یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں۔ یعنی نہ تو کسی کو خدا یا خدا کا بیٹا اور بیٹی قرار دیا گیا اور نہ ہمہ اوست اور اوتار کے عقائد پیدا ہوئے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلماتOO

مبلِّغ اعظم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

مدارج، طریق کار، خصوصیات اور اہداف

مرتب: حافظ محبوب احمد خان

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں جو انبیائے کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے ان تمام کا امتیازی وصف ''بلاغ'' ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہر نبی بنیادی طور پر ایک داعی اور ایک مبلغ قوم ہی ہوتا تھا جو اِنذار (خبردار کرنے) اور تبشیر (بشارت دینے) کے ذریعے اقوام وملل کو گمراہی کی دلدل سے نکالنے کی سعیٔ بلیغ کرتا تھا۔ ان کی تبلیغ ''نذیرعریاں'' کی مانند ہوتی تھی جو کسی بہت بڑے خطرے کو مسلط ہوتا دیکھ کر اپنی قوم کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا ہے اور جو لوگ اس کی آواز پر کان دھرتے ہیں وہ نجات پا جاتے ہیں اور جو لوگ مخالفت کرتے ہیں تباہ ہو جاتے ہیں۔

نبوت ورسالت بجائے خود تبلیغ ہے اور اس لحاظ سے جملہ انبیاء اصولاً مبلغ ہی تھے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامیاب ترین مبلغ ثابت ہوئے ہیں، جنہوں نے اپنے خاص الخاص طریقِ تبلیغ سے وہ انقلاب برپا کیا جو تاریخ عالم میں بے مثال ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی ایک بے مثال داعی اور کامیاب مبلغ کی زندگی ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد اگرچہ آپؐ کو مدینہ منورہ میں حکمران کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، مگر آپؐ پھر بھی ایک مبلغ ہی رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کی بے مثال کامیابی کا راز صرف اور صرف آپؐ کی کامیاب اور بااصول تبلیغ میں مضمر ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) مکّی دَور: جو تیرہ سال کے عرصے پر محیط ہے۔

(۲) مدنی دَور: جو تقریباً دس سال کے زمانے پر حاوی ہے۔

ان دونوں عرصوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یکساں جذبے اور وفورِ انہماک سے مصروفِ تبلیغ رہے، مگر ان دونوں ادوار میں آپؐ کی تبلیغ اور اس کا اسلوب قدرے مختلف رہا۔ مکی زندگی میں تبلیغ زیادہ تر نجی اور انفرادی سطح پر کی جاتی رہی، جبکہ مدنی دور میں انفرادی سطح پر تبلیغ کے علاوہ خطوط اور وفود کی صورت میں بھی تبلیغ کی گئی۔

تبلیغ کے مدارج

مکّی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ کے دو درجے تھے:

(۱) تبلیغ بہ خویش و اقارب: رسول اللہ ﷺ کو اپنوں کو تبلیغ کا حکم بالفاظِ قرآنی ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝٢١٤﴾ (الشعراء) دیا گیا۔ چنانچہ تقریباً تین سال تک آپؐ نہایت خاموشی سے اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب میں تبلیغ فرماتے رہے، جس کے نتیجے میں تقریباً چالیس مرد و زن مشرف باسلام ہوئے۔ یہ عرصہ جو ''فترۃِ وحی'' کا عرصہ کہلاتا ہے، مکّی دور میں تبلیغ نبویؐ کے کامیاب ترین ادوار میں سے ہے۔ اس عرصے میں ایسی نیک فطرت ہستیوں نے اسلام قبول کیا جنہوں نے مستقبل میں نہایت اہم کام سرانجام دیے۔ یہ چالیس نفوسِ قدسیہ **السابقون الاوّلون** کا مصداق ہیں۔ آپؐ کا یہ اندازِ تبلیغ نفسیاتِ انسانی کے عین مطابق تھا۔ اس لیے کہ دوسروں کو تبلیغ کرنے سے پہلے خود کو، اپنے رشتہ داروں کو اور اپنے دوست و احباب کو ساتھ ملانا اور اپنی کاوش کے عملی نمونے پیش کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے، ورنہ کج طبع لوگ بہانہ بسیار تلاش کر لیتے ہیں، اور ویسے بھی انسان اپنی نجی زندگی میں سب سے زیادہ اپنے قریبی لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔

(۲) تبلیغ عامّہ یا بعثت عامّہ: اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کو الفاظِ قرآنی ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝٩٤﴾ (الحجر) کے ذریعے حکم دیا گیا کہ آپؐ تبلیغ کے حلقے کو وسیع کر دیں اور خاص و عام کو پیغامِ حق پہنچائیں۔ چنانچہ آپؐ نے تبلیغِ عامہ کا آغاز قریشِ مکہ کو کوہِ صفا کے پاس ''یا آلِ غالب'' کہہ کر جمع کرنے اور اپنے خاندان والوں کو کھانے کی دعوت پر بلانے سے کیا۔ آپؐ نے امرِ خداوندی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے فریضۂ تبلیغ ادا کیا، جس میں آپؐ بڑی حد تک کامیاب رہے۔

طریقِ تبلیغ

تیرہ سالہ مکّی دَور میں رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اپنائے:

(۱) انفرادی تبلیغ: نبی اکرم ﷺ نے تبلیغ کا آغاز انفرادی اور نجی سطح سے فرمایا، چنانچہ سب سے پہلے اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تبلیغ فرمائی، وہ اسلام لے آئیں۔ اپنے رفیقِ خاص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تبلیغ کی، انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اپنے چچا زاد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دعوت اسلام دی، وہ مشرف باسلام ہو گئے۔ اپنے غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو تبلیغ کی اور وہ اسلام لے آئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی انفرادی سطح کی کوششوں سے تقریباً پانچ افراد نے اسلام قبول کیا۔ تین سال کے عرصے میں چالیس افراد کا اسلام قبول کرنا اس طریقۂ تبلیغ کی خصوصی نوعیت (پُرامن ترغیبی و روحانی طریق) کی کامیابی کی روشن دلیل ہے۔

(۲) اجتماعی تبلیغ: نبی اکرم ﷺ نے مختلف مواقع پر اجتماع کی صورت میں بھی تبلیغ حق فرمائی۔ سب سے پہلے آپؐ نے پہاڑی والے وعظ سے اس کا آغاز فرمایا۔ پھر آپؐ نے اپنے خاندان (بنو ہاشم) کو کھانے پر بلایا، جس میں کم وبیش چالیس نفوس تھے، ان کے سامنے اسلام کی تبلیغ فرمائی۔ اسی طرح حج کے موقع پر سارے عرب سے زائرین مکہ مکرمہ آتے تھے۔ اس لیے اس موسم میں کہی ہوئی بات بہت جلد اطراف واکنافِ عرب تک پھیل جاتی تھی اور دوسرے یہ کہ اُن دنوں آپؐ کو تبلیغ حق سے کوئی ممانعت نہ ہوتی تھی۔ شعب بنی ہاشم میں محصوری (۷ تا ۱۰ نبوی) کے دوران میں صرف ایامِ حج میں آپؐ کو باہر نکلنے کی اجازت ملتی تھی۔ بنابریں ان دنوں میں آپؐ کی سرگرمیاں عروج پر ہوتیں۔ آپؐ مختلف قبائل کی خیمہ گاہوں میں تشریف لے جاتے اور ان کے سامنے نہایت پیار اور ہمدردانہ لہجے میں دعوت پیش فرماتے۔ یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا جب تک حجاج کرام حج سے فارغ ہوکر اپنے اپنے گھروں کو نہ لوٹ جاتے۔ اگرچہ ابتدا میں اس طریقہ تبلیغ کو بہت کم پذیرائی ہوئی، مگر ۱۱ نبوی میں اسی موقع پر یثرب کے چھ حق پرست افراد کے قبولِ اسلام سے بالآخر یثرب (مدینہ منورہ) اسلام کا مرکز بن گیا۔ اجتماعی تبلیغ کی غرض سے ہی آپ ﷺ عرب کے مشہور میلوں اور منڈیوں (مثلاً مجنہ، عکاظ و ذوالمجاز) میں تشریف لے جاتے اور وہاں پر آئے ہوئے تمام افراد کو تبلیغ اسلام فرماتے۔ ایسے موقعوں پر ابولہب اور کبھی کبھار ابوجہل آپؐ کا تعاقب کرتا اور چلاّ چلاّ کر لوگوں کو آپؐ کی بات اور تبلیغ سننے سے منع کرتا رہتا۔

(۳) تبلیغ کے لیے دُور دراز کے شہروں کا سفر: رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ حق کے لیے دُور دراز کے سفر بھی اختیار فرمائے۔ چنانچہ آپؐ اہل طائف کی تبلیغ کے لیے کئی روز کے پُر مشقت سفر کے بعد طائف تشریف لے گئے، جہاں کے باشندوں نے آپؐ سے روح فرسا سلوک کیا اور نہایت بے دردی سے آپؐ پر پتھر برسائے اور آپؐ کو شہر سے نکال دیا۔ اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ تبلیغ و دعوت کے لیے دور دراز کے قبیلوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو اسلام کی دعوت پہنچائی۔ جن قبائل کے پاس آپؐ تشریف لے گئے ان میں بنو عامر بن صعصعہ، بنو محارب بن خصفہ، بنو فزارہ، بنو غسان، بنو مرہ، بنو سلیم، بنو کندہ، بنو کلب، بنو حارث، بنو کعب، بنو عبس، بنو نضر، بنو البکاء، بنو عذرۃ وغیرہ کے متعدد قبائل شامل ہیں، مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی قبولِ حق کی توفیق نہ ملی۔ آپ ﷺ ان قبائل کو تبلیغ فرمانے کے لیے ان کی قیام گاہوں میں تشریف لے جاتے تھے۔ تبلیغ کا یہ فریضہ رنج ہو یا راحت، ہر حالت اور ہر صورت میں جاری رہتا۔ شعب بنی ہاشم میں تین سال کی فاقہ کشی کے باوجود جب بھی آپؐ کو موقع ملا تو آپؐ نے تبلیغ حق کا فریضہ ادا کیا۔ سفر ہجرت میں آپؐ کی تبلیغ سے کئی افراد نے اسلام قبول کیا۔

(۴) تبلیغ کے لیے سفیروں کا تقرر: مکّی دَور ہی میں آپؐ نے دور دراز کے لوگوں کی طرف مختلف افراد بطور سفیر نامزد کر کے بھیجے تاکہ وہ آپؐ کی طرف سے اپنی قوموں کو خدائی پیغام پہنچائیں۔ چنانچہ حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ کو ان کی قوم پر اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کو یثرب کے علاقے میں اپنی طرف سے مبلغ نامزد کر کے بھیجا۔

مکّی دور کی کامیاب اور پُرعزم تبلیغ کے باعث اب آپؐ اس لائق ہو گئے تھے کہ اپنے جاں نثاروں پر اعتماد کرتے ہوئے یثرب (مدینہ منورہ) کو اپنا مستقل مرکز اور مستقر قرار دے لیں۔ چنانچہ ۴ ربیع الاوّل ۱۳ نبوی کو آپؐ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ یہاں سے آپؐ کی زندگی کا دوسرا دَور شروع ہوتا ہے جو ایک داعیٔ حق کے ساتھ ساتھ آپؐ کی حکمرانی کا دَور بھی ہے، مگر اس دور میں بھی آپؐ کی داعی کی حیثیت تبدیل نہ ہوئی، البتہ طریقہ تبلیغ میں کسی قدر عمومیت اور وسعت پیدا ہوگئی، جو زمانی و مکانی تبدیلیوں کا ناگزیر نتیجہ تھی۔ اس عرصے میں انفرادی تبلیغ کے علاوہ (جو تمام زندگی آپؐ کا شعار رہی) تبلیغ حق کے لیے آپؐ نے مندرجہ ذیل طریقے اختیار فرمائے:

(۱) تبلیغی وفود کی ترسیل: اس دَور میں افراد کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے وفود کو بھی تبلیغ اسلام کے لیے مأمور فرمایا‘ جن میں سے دو تبلیغی وفود کے ساتھ مشرکین نے دھوکہ کیا اور فریب کاری سے انہیں قتل کر دیا۔ان میں سے آپؐ نے ایک وفد کو‘ جو ستر تربیت یافتہ قاری حضرات پر مشتمل تھا‘ ۴ ہجری میں ابوبراء الکلابی رئیسِ قبیلہ کی درخواست پر قبیلہ بنوکلب کی طرف بھیجا‘ مگر عامر بن طفیل الکلابی نے بئر معونہ کے مقام پر ان تمام افراد کو شہید کر دیا۔ ان میں سے صرف ایک صحابی بمشکل جان بچا سکے۔ دوسری جماعت کو‘ جو کم و بیش دس افراد پر مشتمل تھی‘ قبائل عضل و قارہ کی طرف اسی سال بھیجا گیا‘ جنہیں مقام رجیع پر بنولحیان کی مدد سے شہید کر دیا گیا۔ان میں سے آپ ﷺ کے بعض تبلیغی وفود کامیاب بھی رہے اور ان کے نتیجے میں متعدد افراد کو قبولِ حق کی توفیق ہوئی۔

(۲) میدانِ کارزار اور فریضۂ تبلیغ: مدنی دور میں غزوات و سرایا کا سلسلہ شروع ہوا۔اس ضمن میں آپؐ کے واضح احکام تھے کہ عین لڑائی کی حالت میں بھی پہلے مخالفین کو تبلیغ کی جائے۔

سریۂ موتہ کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے عسکر اسلام کو الوداع کہا تو سالارِ جیش حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو یوں نصیحت فرمائی کہ جب تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو تو اس کے سامنے اوّلاً تین باتیں پیش کرنا‘ اگر وہ ان میں سے کوئی ایک بھی قبول کر لیں تو لڑائی سے رک جانا: (۱) قبولِ اسلام کی دعوت۔(۲) جزیہ ادا کرنے پر صلح کی ترغیب۔(۳) تیسری اور ناگزیر صورت لڑائی کی ہے۔اسی طرح غزوۂ احزاب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن عبدِ وُدّ (ایک مشرک سردار) کے سامنے یہی تین شرائط پیش کیں۔غرضیکہ ہر معرکے میں آپ ﷺ کی یہ اصول پرستی دیکھنے میں آئی۔

(۳) مذہبی اجتماعات: مدنی دور میں تبلیغ نبویؐ کے لیے ایک سازگار ماحول میسر آیا‘ چنانچہ رسول اللہ ﷺ مذہبی اجتماعات کے مواقع سے فائدہ اٹھاتے تھے۔اس ضمن میں جمعہ و عیدین کے اجتماعات انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ حجۃ الوَداع کے موقع پر آپ ﷺ نے جو وعظ فرمایا وہ تبلیغ کے باب میں اہم دستاویز ہے۔

(۴) عورتوں کے اجتماعات میں تبلیغ: عورتوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے لیے ایک الگ دن مقرر کیا جائے جس میں صرف عورتیں ہی شریک مجلس ہو کر آپؐ کے ارشادات سن سکیں۔اس پر آپ ﷺ نے ان کے لیے ایک الگ دن مقرر فرمایا۔اُس روز آپ ﷺ حضرت بلالؓ کی معیت میں خواتین کے اجتماع میں تشریف لے جاتے اور عورتوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔

(۵) تبلیغی خطوط کی ترسیل: صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مختلف ممالک کے حکمرانوں اور اہل اقتدار کو تبلیغی مکتوبات ارسال فرمائے‘ جن میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا‘ جبکہ بعض کا جواب نفی کی صورت میں ملا۔تبلیغی خطوط کی تفصیل یہ ہے:

(۱) والیٔ یمامہ ہوذہ بن علی الحنفی	قاصد حضرت سلیط بن عمرو العامریؓ
(۲) والیٔ بحرین منذر بن ساویٰ	قاصد حضرت علاء بن حضرمیؓ
(۳) والیٔ عمان جیفر بن جلندی	قاصد حضرت عمرو بن العاصؓ
(۴) والیٔ دِمشق حارث بن ابی شمر	قاصد شجاع بن وہب الاسدیؓ
(۵) شہنشاہ حبش نجاشی اصحم بن ابجر	حضرت جعفر طیارؓ و عمرو بن امیہ الضمریؓ

(۶) حاکم مصر مقوقس جریج بن مینا — قاصد حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ

(۷) شہنشاہ فارس کسریٰ خسرو پرویز — قاصد حضرت عبداللہ بن حذافہؓ

(۸) قیصر روم ہرقل — قاصد حضرت دِحیہ بن خلیفہ الکلبیؓ

(۹) پاپائے روم ضغاطر الاسقف — قاصد نامعلوم

اس کے علاوہ عرب میں آباد مختلف قبائل کے شیوخ کو بھی آپ ﷺ نے اسی قسم کے تبلیغی خطوط ارسال کیے۔

راہِ تبلیغ میں مصائب ومشکلات

اس موقع پر معاندینِ اسلام کے اُن حربوں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جن کا مقصد رسول اللہ ﷺ کو تبلیغِ حق سے روکنا اور اشاعت کی تحریک کو مسدود کرنا تھا، مگر آپ ﷺ نے ان تمام مصائب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔

(۱) سبّ وشتم: معاندین اسلام کی طرف سے آپ ﷺ کو وقتاً فوقتاً (معاذ اللہ) برا بھلا کہا جاتا تھا جس کا مقصد آپ ؐ کو پریشان و ہراساں کرنا اور اپنے مشن کی تکمیل سے روکنا تھا۔ اس کا آغاز اسی وقت سے ہو گیا تھا جب کہ آپ ﷺ نے کوہِ صفا سے اپنی رسالت حق کا اعلان فرمایا تھا۔ اس موقع پر ابولہب نے کہا تھا: تبًّا لك ألهذا جمعتنا؟ یعنی (معاذ اللہ) تو ہلاک ہو، کیا تو نے ہمیں اس لیے بلایا تھا؟ اس کے علاوہ مشرکین مکہ آپ ﷺ کو ساحر، مجنون، مفتون اور ''محمد (ﷺ)'' کی بجائے ''مذمم'' کے نام سے پکارتے تھے۔

(۲) استہزاء: استہزائیہ جملے سبّ وشتم کے جملوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ حربہ جس شدت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے خلاف آزمایا گیا اس کی تاریخ میں کم ہی مثالیں ملتی ہیں۔ آپ ﷺ جس طرف جاتے، لوگ استہزاء کے زہریلے جملوں سے آپ ؐ کا استقبال کرتے۔ ۱۰ نبوی میں جب آپ ﷺ طائف تشریف لے گئے تو سردارانِ طائف میں سے ایک نے کہا کہ کیا خدا کو تیرے سوا نبی بنانے کے لیے کوئی اور ملا ہی نہ تھا؟ دوسرے نے کہا کہ اگر خدا نے تجھے نبی بنا کر بھیجا ہے تو کعبے کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ بعض لوگوں مثلاً اسود بن عبد یغوث وغیرہ نے آپ ﷺ کا مذاق اڑانے میں بہت نام پیدا کیا تھا۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿إِنَّا كَفَيْنَٰكَ الْمُسْتَهْزِءِينَ ۝٩٥﴾ (الحجر) ''یقیناً ہم آپ کے لیے تمسخر کرنے والوں کے مقابلہ میں کافی ہیں۔''

(۳) جسمانی ایذائیں: اس کے علاوہ رحمتِ دو عالم ﷺ کو مختلف موقعوں پر جسمانی اذیتیں بھی پہنچائی گئیں۔ جب آپ ﷺ نے پہلے پہلے بیت اللہ شریف کے سامنے تبلیغ کی تو مشرکین نے آپ ؐ پر ہلہ بول دیا۔ آپ ﷺ کو بچانے کی غرض سے حارث بن ابی ہالہ آگے بڑھے، مشرکین نے مار مار کر انہیں شہید کر دیا۔ یہ اسلام کے پہلے شہید تھے۔ ایک دفعہ غلاظت سے بھری ہوئی اوجھڑی عین حالت نماز میں جسم اطہر پر رکھ دی گئی۔ اُمّ جمیل زوجہ ابی لہب (آپ ؐ کی چچی) آپ ؐ کے راستے میں کانٹے بکھیرتی اور آپ ؐ پر غلاظت پھینک دیتی تھی۔ ۱۰ نبوی میں آپ ؐ طائف میں بغرضِ تبلیغ تشریف لے گئے اور دس روز تک بنو ثقیف کو دعوتِ حق دیتے رہے، لیکن ان ظالموں نے آپ ؐ کو اتنا مارا کہ جسم اطہر لہولہان ہو گیا اور جوتے پاؤں سے چپک کر رہ گئے۔

(۴) دنیاوی منافع کا لالچ: ان سب طریقوں کے باوجود جب آپ ﷺ تبلیغ رسالت سے نہ رکے تو مشرکین کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ نے آپ ﷺ کو دعوتِ حق سے دستبردار ہونے کی صورت میں مکہ مکرمہ کی بادشاہت' بڑے گھرانوں کی خوبصورت عورتوں سے شادی اور مال و دولت کے ذخیروں کی پیشکش کی' لیکن آپ ﷺ نے جواب میں سورۂ حم السجدۃ کی آیات تلاوت فرما کر ان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ ایک دوسرے موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''بخدا اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند بھی لا کے رکھ دیں تب بھی میں تبلیغِ حق سے نہ رکوں گا۔''

(۵) اہلِ اسلام پر ظلم وستم: اس پر بھی جب اسلام کی اشاعت نہ رکی تو آپ ﷺ کے ماننے والوں پر ظلم وستم اور جور و تعدی کی انتہا کر دی گئی۔ مشرکین کے ظلم وستم کا نشانہ بننے والے بے کس مسلمانوں میں حضرت خباب بن الارت' حضرت بلال حبشیؓ' حضرت صہیب رومی' حضرت ابوفکیہہ' حضرت لبینہ' حضرت زنیرہ' حضرت عمار بن یاسر اور ان کے والدین حضرت یاسر اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں جن کو روح فرسا طریقوں سے مارا پیٹا گیا اور ان میں سے بعض کو شہید کر دیا گیا۔

(۶) معاشی و معاشرتی عدمِ تعاون: اس سب کے باوجود بھی جب اشاعتِ اسلام کا راستہ نہ روکا جا سکا تو بالآخر ے نبوی میں رؤسائے قریش کی باہمی مشاورت سے ایک معاہدہ ترتیب دیا گیا جس کے مطابق قریش اور ان کے حلیفوں نے آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے حلیفوں سے معاشی و معاشرتی عدم تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا اور انہیں شعب بنی ہاشم میں محصور کر دیا گیا۔ اس ضمن میں تین باتوں پر تمام اہل مکہ سے حلف لیا گیا: (۱) ان سے مناکحت نہ کی جائے۔ (۲) ان کو کوئی چیز فروخت نہ کی جائے۔ (۳) ان سے کوئی چیز نہ خریدی جائے۔ اسے باقاعدہ معاہدے کی صورت میں بیت اللہ شریف پر لٹکا دیا گیا۔ یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔ اس دوران بنو ہاشم کے لوگوں' بالخصوص بچوں کی حالت نہایت نازک رہی۔ یہ لوگ سوکھے چمڑے ابال کر اور کھا کھا کر گزارا کرتے رہے' مگر دشمنوں کو ان پر ذرا رحم نہ آیا۔ اندازہ کیجئے جب رحمۃ للعالمین ﷺ اپنے خاندان کے معصوم بچوں کو بھوک سے بلبلاتے ہوئے دیکھتے ہوں گے تو آپؐ کے دل پر کیا گزرتی ہوگی!

(۷) تذلیل وتحقیر: آنحضرت ﷺ کی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہر ممکن طریقے سے تذلیل وتحقیر کی کوشش کی جاتی تھی' یہاں تک کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ خود آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں دو بدترین ہمسایوں ابولہب اور عقبہ بن ابی معیط میں گھرا ہوا تھا اور وہ دونوں اپنے گھر کی غلاظت اور گندگی لا کر میرے دروازے پر ڈال دیتے تھے' آپ ﷺ برآمد ہو کر صرف یہ فرماتے: اے عبدمناف کی اولاد! یہ کس قسم کی ہمسائیگی ہے؟ پھر آپؐ اسے راستے سے ہٹا دیتے۔

(۸) ذاتِ نبویؐ کا تعاقب: اس کے باوجود جب روز بروز اسلام ترقی کرتا رہا تو مخالفین نے اس کی اشاعت کو روکنے کے لیے ایک تدبیر یہ اختیار کی کہ تبلیغ کے مواقع پر ابولہب اور بعض اوقات ابوجہل آپ ﷺ کے تعاقب میں لگا رہتا' آپؐ جس علاقے میں تشریف لے جاتے وہ چلّا چلّا کر لوگوں کو آپؐ کی باتیں سننے سے روکتا۔

(۸) بے سرو پا سوالات ومطالبات: مشرکین مکہ نے جب یہ تمام حربے ناکام ہوتے دیکھے تو بے سرو پا سوالات کرنے شروع کر دیے۔ چنانچہ ایک موقع پر یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہم اس صورت میں آپؐ کو نبی مان سکتے ہیں کہ آپ (۱) مکہ مکرمہ کی خشک پہاڑیوں سے میٹھے پانی کے چشمے جاری کر کے دکھائیں۔ (۲) آپؐ اس سرزمین میں اپنے لیے کھجوروں اور انگوروں کا باغ اگا کر دکھائیں جس کے درمیان نہریں چلتی ہوں۔ (۳) آسمان کا کوئی ٹکڑا بطورِ عذاب ہم پر گرا کر دکھائیں۔ (۴) خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نمودار کر کے دکھائیں۔ (۵) اپنے لیے موتیوں کا کوئی محل بنا کر پیش کر دیں۔ (۶) ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور ہم سب کے نام خدا تعالیٰ کی طرف سے لکھے لکھائے خطوط لا کے پیش کریں۔ ان تمام باتوں کے جواب میں آپ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ کہہ دیں کہ میں تو بشر ہوں اور اس کا رسول ہوں۔ اس کے علاوہ مشرکین یہود سے ایسے علمی سوالات معلوم کر کے نبی اکرم ﷺ سے ان کے جوابات دریافت کرتے جو انبیاء کے علاوہ کسی کو نہیں آتے۔ مثلاً نفس اور روح کی حقیقت کیا ہے؟ اصحابِ کہف کا کیا قصہ ہے؟ ذوالقرنین کون تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے سوالات کے جوابات قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر دیے گئے ہیں۔

(۹) جھوٹا اور بے بنیاد پروپیگنڈا: اس کے علاوہ اسلام کے خلاف جھوٹے اور بے بنیاد پروپیگنڈے کا حربہ جس وسیع پیمانے پر اختیار کیا گیا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ہر آنے جانے والے کو آگاہ کر دیا جاتا کہ یہاں ایک ساحر' مجنون رہتا ہے' اس سے بچنا۔ جیسا کہ طفیل بن عمرو دوسی کو روکا گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کو اپنے آبائی دین کا منکر بتایا جاتا' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صابی کہا جاتا۔ جب قرآن کریم کی تلاوت ہو رہی ہوتی تو شور وغل مچا دیا جاتا۔ معاذ اللہ قرآن اور صاحبِ قرآن کو برا بھلا کہا جاتا۔ بچوں کو پیچھے لگا دیا جاتا کہ وہ مجنون' ساحر وغیرہ کا شور برپا رکھیں' مبادا کوئی آپؐ کی بات سن کر متأثر نہ ہو جائے' جیسا کہ ضماد الازدی کو ذاتی مشاہدہ ہوا۔ اور سب سے آخر میں آپ ﷺ کے خلاف ایکا کر کے (معاذ اللہ) آپؐ کو قتل کرنے کی ناپاک سازش تیار کی گئی' جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بال بال بچا لیا۔

معاندینِ اسلام کے یہ وہ حربے تھے جو انہوں نے مکّی دور میں روا رکھے۔ ۱۳ نبوی میں رسول اللہ ﷺ نے اُس وقت ہجرت کرنے کا فیصلہ فرمایا جبکہ تمام اہل مکہ نے آپؐ کے قتل کا ناپاک منصوبہ بنا لیا تھا۔ آپؐ نے جب ارضِ یثرب میں قدم رنجہ فرمایا اور وہیں سکونت اختیار کر لی تو معاندین اور مخالفین اسلام کے طریقوں میں بھی تبدیلی اور وسعت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ مدنی دَور میں آپ ﷺ کو تبلیغ اسلام سے روکنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیے گئے:

(۱) قریش کا عبداللہ بن ابی کے نام خط: ابھی آپؐ مدینہ منورہ میں فروکش ہوئے ہی تھے کہ قریش مکہ نے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کو خط لکھا جس میں انصارِ مدینہ کو برا بھلا کہنے کے بعد مطالبہ کیا گیا کہ وہ آپ ﷺ کو (معاذ اللہ) مشرکین کے حوالے کر دیں' ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔

(۲) قریش اور ان کے حلیفوں کا اعلان جنگ: جب اس طرح ان کی مقصد براری نہ ہوئی تو قریش مکہ اور ان کے حلیفوں کی طرف سے رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا گیا۔ قریش مکہ اور یہودانِ خیبر نے اپنے شعلہ بیان مقرروں اور آتش نوا شاعروں کے ذریعے تمام قبائل عرب کو اسلام کے خلاف متحد کر دیا۔ چنانچہ نو سال کے مختصر عرصے میں آپ ﷺ کو مخالفین کے خلاف ۲۷ غزوات اور ۴۷ سرایا لڑنا پڑے۔ گویا آپ ﷺ کو ایک سال میں تقریباً آٹھ یا نو بار مخالفین کے خلاف صف آراء ہونا پڑا۔ اسی سے مشرکین عرب کی اسلام دشمنی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۳) مبلغین کا قتل: بعض عرب قبائل نے اسلام کی تبلیغ واشاعت کو روکنے کے لیے انوکھا اور منفرد طریقہ اختیار کیا۔ وہ یہ کہ ان کی طرف سے کوئی آدمی یا کوئی وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنے قبیلے کے لیے مبلغین بھیجنے کی درخواست پیش کرتا۔ آپ ﷺ ان کی دعوت پر مبلغین ارسال فرما دیتے تو انہیں دھوکے سے راستے میں شہید کر دیا جاتا۔ یہ واقعہ دو دفعہ دہرایا گیا۔ پہلی دفعہ بئر معونہ کے مقام پر ستر صحابہ کرام اور دوسری دفعہ رجیع کے مقام پر دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نہایت بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ یہ صحابہ انہی قبائل کے سرکردہ افراد کی درخواست پر تبلیغ اسلام کے پُر امن مشن کے لیے جا رہے تھے۔

(۴) قاصدانِ نبویؐ کا قتل: ۶ ہجری میں آپ ﷺ نے ایک خط شاہ بصریٰ کے نام لکھا تھا جسے حضرت حارث بن عمیر الازدیؓ لے کر جا رہے تھے، شرحبیل بن عمرو الغسانی رئیس علاقہ بلقاء نے انہیں موتہ کے مقام پر گلا گھونٹ کر شہید کر دیا۔

آنحضرت ﷺ کی تبلیغی خصوصیات

اب آیئے ان خصوصیات کی طرف جن کی بدولت محمد رسول اللہ ﷺ کی تبلیغی مساعی کو وہ قبولیت حاصل ہوئی جو دنیا کی کسی تحریک کو نصیب نہیں ہوئی۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط﴾ (النحل:۱۲۵)

''(اے پیغمبرؐ!) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلایئے اور بہت ہی اچھے طریقے سے ان سے بحث کیجیے''۔

یہ آیت مبارکہ آپ ﷺ کے طریقِ تبلیغ اور اسلوبِ دعوت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس سے آپ ﷺ کی حسبِ ذیل تبلیغی خصوصیات واضح ہوتی ہیں:

(۱) تدریج: پہلا اصول جو اس آیت مبارکہ کے ابتدائی جملے ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ﴾ سے مستنبط ہوتا ہے، دعوت اسلامی میں تدریج کا لحاظ رکھنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مکّی اور مدنی دونوں ادوار میں ہمیشہ تبلیغ میں اس تدریج کے اصول کو ملحوظِ خاطر رکھا۔ اسی بنا پر ۱۳ سالہ مکّی دور میں صرف ارکانِ اسلام، توحید، رسالت، معاد اور مسئلۂ تقدیر کی تبلیغ کی گئی اور دوسرے احکام مدنی زندگی میں رفتہ رفتہ دیے گئے۔ اس کی حکمت اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یوں بیان فرماتی ہیں کہ قرآن کریم میں جو پہلی سورت نازل ہوئی اس میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے۔ جب معتد بہ لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے تو پھر حلال و حرام کے احکام دیے گئے۔ اگر شروع ہی میں امتناعی احکام آ جاتے تو لوگوں کو گراں گزرتے اور تعمیل میں تأمل بلکہ انکار ممکن تھا۔ دراصل یہ طریقہ طبع انسانی کی گہری خصوصیات کے ادراک کا پتا دیتا ہے۔ آسان سے مشکل کی طرف بڑھنا زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف روانہ کرتے وقت بھی تبلیغ میں اسی اصول کی تدریج کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پہلے ان کو توحید و رسالت کی دعوت دینا، اگر وہ مان جائیں تو پھر ان کو نماز کی تعلیم دینا، اگر وہ یہ بھی مان لیں تو پھر ان کو فریضۂ زکوٰۃ سے آگاہ کرنا۔

(۲) حکمت: حکمت کے یوں تو بہت سے مفہوم بیان ہوئے ہیں، مگر ابو حیان الاندلسی کی یہ تعبیر عام طور پر قبول کی جاتی ہے کہ حکمت وہ کلام یا اسلوب ہے جس میں اکراہ کا پہلو موجود نہ ہو اور طبع انسانی اسے فوراً قبول کر لے اور وہ عقل و قلب ہر دو کو متأثر کرے۔ حکمت اس درست کلام اور مؤثر طرزِ ابلاغ کا نام ہے جو انسان کے دل میں اتر جائے اور مخاطب کو مسحور کر دے۔ اس بارے میں آپ ﷺ کو جو اختصاص و امتیاز حاصل تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ عرب کے مشہور کاہن ضماد الازدی نے جب آپؐ کا اثر انگیز خطبہ سنا تو اعتراف کیا کہ ایسا کلام نہ کاہنوں کے پاس

ہے نہ جادوگروں اور شاعروں کے پاس۔ اس پر اس نے اسلام قبول کر لیا۔ مشہور شاعر اور رئیسِ دوس طفیل بن عمرو الدوسی کو کلامِ نبویؐ سن کر اعتراف کرنا پڑا کہ میں نے اس سے عمدہ کلام آج تک نہیں سنا۔ غزوۂ حنین کے بعد جب انصار میں کچھ بددلی پیدا ہوئی تو آپؐ کے پُر اثر خطبہ سے ان کے جملہ شکوک وشبہات کا ازالہ ہو گیا۔

(۳) اَلْمَوْعِظَةُ الْحَسَنَةُ: موعظہ کا مادہ ''وعظ'' ہے اور وعظ کے معنی ہیں کسی کی خیر خواہی کی بات کو اس طرح اس کے سامنے بیان کیا جائے کہ جس سے اس کا ناگوار حصہ بھی قابل قبول ہو جائے اور مخاطب کا دل قبولیت کے لیے نرم ہو جائے۔ حسنہ کے معنی ہیں کہ اس کا عنوان بھی ایسا ہو کہ جس سے مخاطب کا قلب مطمئن ہو جائے۔ نبی اکرم ﷺ کی تبلیغ و دعوت کی یہ بھی خصوصیت قابل ذکر ہے کہ آپؐ کا اندازِ تبلیغ بھی ایسا دلکش اور جامع ہوتا تھا کہ سوائے ہٹ دھرم اور ضدی لوگوں کے کوئی شخص بھی آپؐ سے دور نہ رہ سکتا تھا۔ اثر انگیزی کی اسی کیفیت سے متأثر ہو کر قریش مکہ نے آپ ﷺ کو ''ساحر'' (جادوگر) کا نام دیا تھا۔ خود رؤسائے قریش' مثلاً ابوجہل' ابوسفیان' اخنس بن شریق جیسے لوگ رات کو چھپ چھپ کر کلامِ الٰہی کی معجزاتی بلاغت کو سنتے اور سر دھنتے تھے۔ یہ اسی موعظہ حسنہ کا اثر تھا کہ عمیر بن وہب الجمحی جو آپ ﷺ کو قتل کرنے کی نیت سے گھر سے روانہ ہوا تھا' آپؐ کی خدمت میں پہنچ کر مشرف باسلام ہو گیا۔

(۴) مجادلۂ احسن: قرآن مجید میں دو قسم کے مجادلوں کا ذکر آتا ہے: (۱) مجادلۂ احسن اور (۲) مجادلۂ باطل۔ مجادلہ باطل کو کفار و مشرکین کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس سے مراد بلاکسی معقول دلیل کے اپنے موقف پر اصرار' غیر متعلق باتوں میں مسئلے کو الجھا دینے کا طریقہ' بے فائدہ کج بحثیوں میں تضیع اوقات اور خواہ مخواہ کی موشگافیاں کرنا ہے۔ یہ ہمیشہ سے اہل باطل کا شیوہ رہا ہے۔ اس کے برعکس اہل حق کو ابتداءً تو یہ تلقین کی گئی کہ جہاں تک ہو سکے معاملے کو مجادلے تک نہ پہنچنے دیں۔ اگر مجادلے کی ضرورت پیش آ ہی جائے تو مجادلے کو مجادلۂ احسن بنائیں' جس کا مطلب ہے کہ مخاطب کے سامنے پہلے ان باتوں کو پیش کریں جن میں اصولی طور سے اشتراک ہے۔ مخاطب کو مطمئن اور قائل کرنے کے لیے محبت' اعتماد' حسنِ اخلاق اور حسنِ استدلال سے کام لیا جائے۔ سیرت نبویؐ میں مدینہ منورہ کی زندگی میں آپ ﷺ کا یہودیوں سے اور اہل نجران کے عیسائیوں سے مباحثہ اس کی نمائندہ مثالیں ہیں۔

(۵) قولِ لیّن: قول لیّن سے مراد نرم بات ہے۔ بلاشبہ مبلغ حق کی باتوں میں نرمی کے عنصر کا پایا جانا ضروری ہے۔ آنحضرت ﷺ میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ نرمی' ملاطفت اور مہربانی کا جو برتاؤ آپؐ نے اپنے دشمنوں سے کیا اور جس نے ابوسفیان بن حرب' عکرمہ ابن ابی جہل' عمرو بن وہب الجمحی' ہند بنت عتبہ اور صفوان بن امیہ جیسے بے شمار لوگوں کی کایا پلٹ دی' وہ دنیا کی تاریخ میں ایک مثال ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے جانی دشمنوں کو بھی اپنی نرمی اور شیریں گفتار سے اپنا اور اسلام کا گرویدہ بنا لیا۔

(۶) تأ لیفِ قلب: سرورِ کائنات ﷺ کی ایک اور تبلیغی خصوصیت تأ لیفِ قلب ہے۔ یعنی آپ ﷺ کا وہ سلوک جو غیر مسلموں اور بعض نو مسلموں کے ساتھ اس غرض سے آپؐ نے کیا کہ وہ اسے اسلام کو شفقت اور حسنِ سلوک کا نمونہ خیال کریں۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے اپنے قدیمی دشمنوں کی عام معافی کا اعلان فرمایا۔ یہ اقدام تأ لیف قلوب میں معاون ہوا اور صرف چند دنوں میں دو ہزار قریش مسلمان ہو گئے۔ غزوۂ حنین کی فتح کے بعد مالِ غنیمت میں سے آپ ﷺ نے بالخصوص نو مسلموں کو زیادہ حصہ دیا جس کا مقصد بھی تأ لیف قلب تھا۔ آپؐ کے اس طرزِ عمل نے ان لوگوں کو اور مخلص بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

(۷) شفقت و راٗفت: رسول اللہ ﷺ سے معاملہ کرنے والوں کا یہ متفقہ تأثر ہے کہ آپؐ مجسمۂ شفقت و راٗفت تھے۔ آپ ﷺ فرطِ رحمت سے اُمت کے عدمِ قبولِ حق کی وجہ سے مسلسل غم و فکر میں گھلتے رہے۔ آپ ﷺ کے متعلق صحابہ کرامؓ کا یہ کہنا تھا کہ جو کوئی آپؐ کو پہلی مرتبہ دیکھتا وہ آپؐ کے دبدبے سے مرعوب ہو جاتا اور جو آپؐ سے معاملہ کرتا وہ آپؐ سے محبت کرنے لگتا۔ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے آپؐ سے زیادہ کسی کو مسکرانے والا نہ پایا۔ اس سے آپ ﷺ کی انسان شناسی اور فطرتِ انسانی کے وسیع ادراک کا پتا چلتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تبلیغی زندگی میں جس وصف نے سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا وہ آپؐ کی صفت عفو و درگزر اور حسنِ خلق ہے۔ آپؐ نے اپنے سخت ترین دشمنوں کو عام معافی عطا فرمائی۔ قتل کی نیت سے آنے والوں کو معاف فرمایا۔ اہل طائف کے ظلم و تعدی کے باوجود یہ کہہ کر ان کو معاف کر دیا کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو مجھے امید ہے کہ ان کی اولاد اِس سے بہرہ ور ہوگی۔ غزوۂ اُحد میں جب مسلمانوں نے آپ ﷺ کو لہولہان دیکھ کر مشرکین کے حق میں بددعا کرنے کی درخواست کی تو رحمت مجسم نے فرمایا: ''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت فرما' کیونکہ وہ نہیں جانتے''۔ عبداللہ بن ابی سرح' عکرمہ بن ابی جہل' ہند زوجہ ابوسفیان' صفوان بن اُمیہ اور وحشی بن حرب وغیرہ کو جس طرح معافی عطا کی گئی ہے وہ تاریخ عالم کا منفرد واقعہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کا مضبوط کردار' آپؐ کا اپنی دعوت پر منفرد طرزِ عمل لوگوں کے دل و دماغ کو آپؐ کی تبلیغ کی طرف متوجہ کرنے میں بہت مددگار رتھا' کیونکہ آپؐ کے عمل میں آپؐ کے قول کی صداقت بڑی عمدگی سے دیکھی جا سکتی تھی۔

(۸) جامعیت و اعتدال: رسول اللہ ﷺ کی تبلیغی خصوصیات میں سے ایک اور اہم خصوصیت آپؐ کی جامعیت اور اعتدال ہے۔ مذاہب کی دنیا میں یہی دونوں خصوصیات ناپید رہی ہیں۔ آپؐ سے قبل جتنے بھی مذاہب پیدا ہوئے ان کے رہنماؤں میں زندگی کا کوئی ایک رُخ ہی نمایاں ہے۔ اگر کوئی فلاسفر ہے تو اس کا صرف یہی پہلو قابل تعریف و تقلید ہے' زندگی کے باقی میدانوں میں لوگوں کے لیے اس کے کردار و اخلاق میں کوئی پہلو قابل تقلید نہیں ہے۔ گوتم بدھ ہو یا کنفیوشس' مہادیو ہو یا زرتشت' کوئی بھی جامعیت کے میدان میں آپ ﷺ کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔

دوسری چیز اعتدال و توازن پر مبنی زندگی کا نمونہ ہے' جو بانیانِ مذاہب کی زندگی میں ہمیں نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی عبادت کی جانب گیا ہے تو اس میدان میں فطری حدود بھی عبور کر گیا ہے اور اگر کوئی فلسفہ میں گیا ہے تو عقل و شعور کی وہ حدیں جو کامیاب زندگی گزارنے کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہیں' ان کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ معاشرتی سدھار کی جانب گیا ہے تو حلال و حرام کے وہ پیمانے اور وہ رشتے جن کا احترام انسانی طبیعت میں ودیعت شدہ ہے' اس کی اس سدھار کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ اس میدان میں صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہے جو معاشرتی رشتوں میں توازن پیدا کرتی ہے' معاشی میدان میں کمزور کو طاقتور کے ظلم سے بچانے والی ہے' عوام اور حکمران کے درمیان ایک اعتدال و توازن پر مبنی رشتہ قائم کرتی ہے۔ عورت کو ''دیوداسی'' یا ''دیوی'' کے قدیم تصور سے نکال کر باعزت اور قابل احترام تقدس عطا کرتی ہے۔ میدانِ جنگ میں فاتحین کی خونریزیوں سے الگ ایک قاعدہ وضابطۂ اخلاق فراہم کرتی ہے۔ الغرض آپ ﷺ تاریخ عالم میں ''سیکولر'' اور ''روحانی'' دونوں میدانوں میں کامیابی کی واحد مثال ہیں۔ چنانچہ جب بھی انسان اپنے لیے رہنمائی چاہے گا تو سوائے آپ ﷺ کی شخصیت کے کسی اور کو اپنے لیے رہنما نہیں پائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی تبلیغی خصوصیات اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ آپؐ کی تمام زندگی داعی اور مبلغ کی ہے۔ اسلامی انقلاب کے پس منظر میں سب سے زیادہ جس عامل نے کام کیا وہ آپ ﷺ کی تبلیغ تھی جو نفسیاتِ انسانی کے عمیق مطالعے پر مبنی تھی۔ ہر شخص کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا اصول آپ ﷺ کی تبلیغی زندگی میں عنقا ہے۔ حالات و طبائع میں فرق کے ساتھ آپ ﷺ کے طریقہ تبلیغ میں تبدیلی آ جاتی تھی۔ ''لوگوں سے ان کی عقول کے مطابق بات کرو'' کا اصول ہمیشہ آپؐ کے پیش نظر رہا۔ آپ ﷺ نے ہر شخص سے وہی سلوک فرمایا جس کا وہ حق دار تھا۔

آپ ﷺ ہر شخص سے کامل بشاشت، وفورِ مسرت اور مسکراتے چہرے کے ساتھ پیش آتے جس سے لوگوں کے دل باغ باغ ہو جاتے۔ اگر مخاطب ترش روئی اور تندخوئی سے پیش آتا تو آپ ﷺ قطعاً برا نہ مناتے، اگر ناز یبا گفتگو کرتا تو آپ ﷺ تحمل فرماتے۔ ایک شخص کو آپ ﷺ نے اسلام کی دعوت دی، اس نے کہا کہ مجھے سب باتیں منظور ہیں مگر میں فلاں کام نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ سن کر بعض صحابہ ناراض ہوئے، مگر آپ ﷺ نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے قریب بلایا اور نرمی سے اس کام کی قباحت اس طرح ذہن نشین کرا دی کہ وہ خود ہی اس سے تائب ہو گیا۔ ایک بدو نے مسجد نبویؐ کے ایک گوشے میں پیشاب کر دیا۔ بعض صحابہؓ اُس کو مارنے کے لیے دوڑے، مگر آپ ﷺ نے منع فرما دیا۔ جب وہ حاجت سے فارغ ہو گیا تو نبی اکرم ﷺ نے نہایت نرمی سے اور پیار سے اسے مسجد کی عزت و حرمت سے آگاہ فرمایا اور پانی کا ایک ڈول منگوا کر اُس کے پیشاب پر بہا دینے کا حکم دیا۔ ایک بدو ضمام بن ثعلبہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کئی قسمیں دے کر آپؐ سے پوچھا کہ کیا واقعی آپؐ اللہ کے فرستادہ ہیں؟ آپ ﷺ نے تحمل سے جواب دیا۔ اس نے اپنے اکھڑ انداز میں اور بھی کئی سوالات کیے، مگر آپؐ نے کامل بشاشت سے جواب دیا۔ جب وہ چلا گیا تو آپ ﷺ نے اس کی درشتگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی سادہ لوحی اور جذبۂ اخلاص کی تعریف فرمائی۔

محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ کے ہدف کو سمجھنے کے لیے تین چیزوں کا ذہن میں ہونا ضروری ہے: (۱) آپ ﷺ نبی اور رسول ہونے کے ناتے تائید ایزدی سے بہرہ ور تھے اور غلبۂ دین کے لیے تبلیغی جدوجہد کرتے تھے۔ (۲) آپ ﷺ کا نصب العین کسی دُنیوی قائد کی طرح مادی نہ تھا، بلکہ روحانی تھا اور قرآن کریم کی یہ آیت مبارکہ ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ آپؐ کے تبلیغی ہدف کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیتی ہے۔ آپ ﷺ کا مقصودِ تبلیغ برائے تبلیغ نہیں بلکہ تبلیغ برائے غلبۂ دین تھا۔ اسی لیے آپ ﷺ کی تبلیغی جدوجہد میں تدریج ہے اور آپؐ کے طریقِ کار میں مخاطب کی نفسیات اور عقلی معیار کو جانچ کر اسے تبلیغ کرنا نمایاں نظر آتا ہے۔ تیسری چیز یہ کہ آپ ﷺ سارے عالم کے لیے ہادی و رہنما تھے، کسی گروپ، مسلک، نسل یا وطن کے لیے نہ تھے، بلکہ بالفاظِ قرآنی ﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ کی تصویر تھے۔ oo

(تفصیل کے خواہش مند قارئین اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۹ سے رجوع فرمائیں)

تفہیم دین

معاصر اسلامی ریاستوں میں غیرمسلموں کے قانونی اور مدنی حقوق

حامد عبدالرحمٰن الکاف ☆

معاصر اسلامی ریاستوں میں غیرمسلموں کے قانونی اور مدنی حقوق کے بارے میں وہی پرانا موقف اختیار کیا جاتا ہے کہ وہ ''ذمی'' ہیں اور انہیں ''جزیہ'' ادا کر کے فوجی خدمت سے اپنے آپ کو مستثنیٰ کرنا ہے۔

یہ موقف ان دستوری اور قانونی دُور رس تبدیلیوں کے عدم ادراک کا نتیجہ ہے جو خود مسلم معاشروں میں صدیوں تک بیرونی سامراج کی حکومت کے بعد وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ اِن معاشروں کی مسلم اکثریت اور غیرمسلم اقلیت دونوں سامراج کے مظالم اور لوٹ کھسوٹ کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ دونوں ہی نے سامراجی نظاموں سے گلوخلاصی کی خاطر برابر کی جدوجہد کی اور قربانیاں دی ہیں۔ جب آزادی مل گئی تو مسلم اکثریت کیونکر اور کس طرح اچانک حاکم اور غیرمسلم اقلیتیں محکوم بن گئیں؟ حالانکہ جنگِ آزادی میں دونوں برابر کے شریک تھے اور سامراج کے ظلم وستم کا دونوں ہی خمیازہ بھگت رہے تھے۔

اِن تاریخی تبدیلیوں کو نہ سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس آیت کے معنی ومفہوم کو بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کو ''آیت جزیہ'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴿۲۹﴾﴾ (التوبۃ)

''اہل کتاب میں سے اُن لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نہ یومِ آخرت

☆ صنعاء، یمن

پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ اس چیز کو حرام قرار دیتے ہیں جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اور نہ دینِ حق (اسلام) کی (سیاسی اور سیادتی) برتری کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کا اعلان کرتے ہیں، جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ اس حالت میں دیں کہ وہ ذلیل ہوں۔''

آیت بالا صاف صاف جنگ کے بعد شکست خوردہ لوگوں پر جزیہ عائد کرنے کا حکم دیتی ہے۔ اس طرح جزیہ جنگ میں شکست کا نتیجہ ہوا۔ بالفاظِ دیگر جنگ کے بغیر اور شکست کے بغیر نہ تو جزیہ فرض ہی کیا جا سکتا ہے اور نہ وصول ہی کیا جا سکتا ہے۔ صلح کے معاہدے کی شرائط میں سے یہ کوئی شکل ہو تو یہ بالکل الگ بات ہے۔ یہ صلح اور اس کی شرائط کا نتیجہ ہے نہ کہ جنگ کا۔ بات چیت میں شرائط پر اتفاق اُسی وقت ہوتا ہے جب فریقین لین دین اور سودے بازی کریں، ورنہ بات چیت ناکام ہو جاتی ہے یا کم از کم رُک جاتی ہے۔ بعد میں سیاسی فضا سازگار ہونے پر اسے پھر شروع کیا جاتا ہے۔

جنگ آزادی کے طویل عرصوں میں مسلمانوں نے سامراجی طاقتوں اور حکومتوں سے جاں گسل کشمکش کی، بلکہ بعض اوقات ان سے جنگ بھی کی۔ بہر حال انہوں نے اپنے ہی ملک کی غیر مسلم اقلیتوں سے جنگ نہیں کی تھی اور نہ ان کو شکست ہی دی تھی اور نہ ان پر فتح ہی پائی تھی کہ ان کو ''ذمی'' قرار دے کر اُن پر جزیہ عائد کیا جا سکتا۔

اس وجہ سے اس آیت کے احکام کا اطلاق مسلمان ممالک کی موجودہ صورتِ حال پر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ان ممالک کی زمینیں امتدادِ زمانہ کے ساتھ اور سامراج کے قبضے سے بہت پہلے نہ تو عشری زمینیں رہی ہیں اور نہ ''اہل ذمہ کی زمینیں'' (خراجی زمینیں) رہی ہیں۔ خرید و فروخت، سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے ان کی دستوری اور قانونی پوزیشن بالکل ہی بدل چکی تھی۔ یوں نہ ذمی فرد ہی آج ذمی باقی رہا ہے اور نہ ذمیوں کی زمینیں ذمی (خراجی) رہی ہیں۔ بالفاظِ دیگر نہ تو ملک کے ذمی افراد ہی ذمی رہے ہیں اور نہ ملک بحیثیت ملک، بحیثیت زمین اور بحیثیت رقبہ ذمی رہا ہے۔[۱]

یہ سب حقائق نہایت درجے دور رس، گہری اور بنیادی تبدیلیوں پر دلالت کرتے ہیں۔ اس وجہ سے مسلم ممالک کی اپنی اندرونی تبدیلیوں کی وجہ سے سب شہری برابر کے شہری قرار پاتے ہیں۔ البتہ فرق ہے تو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں مدنی قانون (سول کوڈ) کی حد

---

(۱) دیکھئے: فقہ الزکوٰۃ، ج ۱، ص ۴۱۷، ۴۱۸، اَیْنَ الْاَرْضُ الْخَرَاجِیَۃُ الآن؟ الطبعة الثانیة۔

تک، جو غیر مسلم اقلیتوں کو ان کی اپنی شریعتوں کے مطابق نکاح، طلاق اور وراثت وغیرہ میں ان کی عدالتوں اور ان ہی کے ججوں کے ذریعے احکام صادر کرنے کا حق دیتا ہے۔ رہے عام مدنی، فوج داری اور امن عامہ سے متعلق قوانین، تو وہ عام ملکی قوانین قرار پا کر کیا مسلم کیا غیر مسلم، سب پر یکساں لاگو ہوں گے۔

اسلام کا سب سے زیادہ امتیازی نشان یہ ہے کہ اس نے اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کے حقوق بالکل واضح اور دوٹوک انداز میں بیان کر دیے ہیں۔ سچے مسلمان ان کی دل سے تنفیذ کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ شاید ان میں اضافہ تو کر سکتے ہیں، مگر ان میں کمی کرنے کا ان کو ہرگز اختیار نہیں ہے۔

یوں بھی آج کے دستوروں میں بنیادی انسانی حقوق، جو سب شہریوں کے مشترکہ طور پر حقوق ہوا کرتے ہیں، پوری وضاحت سے بیان کر دیے جاتے ہیں۔ ان کی تنفیذ میں کہیں اونچ نیچ ہو تو عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکتا ہے اور ہر شخص خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم ڈنکے کی چوٹ پر اپنے حقوق حاصل کر سکتا ہے۔

اوپر بیان کردہ وجوہات کے علاوہ آج کل کی دنیا میں مسلمان دیگر غیر مسلم اکثریت کے ممالک میں مسلم اقلیتوں کو ''بنیادی انسانی حقوق''، جن میں کسی عقیدے کو اختیار کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی آزادی بنیادی اہمیت کی حامل ہے، دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں تو وہ کس طرح اپنے ملکوں کی غیر مسلم اقلیتوں کو ''کم تر درجے کا شہری'' قرار دے کر ان سے برابر کا نہیں بلکہ کم تر درجے کا سلوک اختیار کر سکتے ہیں؟

میری اپنی رائے میں زمانے کا تقاضا ہے کہ اس موضوع پر مختلف پہلوؤں اور نقطۂ نگاہ سے سیر حاصل اور مفصل گفتگو کی جائے، تاکہ اس کی روشنی میں کسی متفق علیہ نتیجہ پر پہنچا جا سکے۔

(تشکر: ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور)

افکار و آراء

دینی تعلیم کے مراکز

اور

حکومتی طرزِ عمل

عتیق الرحمٰن صدیقی، ہری پور

قرآن مجید میں اسلامی حکومت کی ذمہ داری یہ بتائی گئی ہے کہ:

﴿اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ﴾ (الحج: ٤١)

''وہ لوگ جن کو ہم زمین میں اگر طاقت دیں تو نماز قائم کریں، زکوۃ دیں، اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں۔''

اسی مقصد کے پیش نظر مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت کی تشکیل کے آغاز ہی میں اہل ایمان کی تعلیم کے اہتمام کی ضرورت محسوس کی گئی اور یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ہر جماعت اور قبیلہ کے لوگ تعلیم سے آراستہ ہوں اور یوں دعوت وارشاد کا عمل جاری رہے اور اسلامی حکومت کا نظم ونسق بھی خوش اسلوبی سے چلتا رہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا کہ:

﴿وَمَا کَانَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لِیَنۡفِرُوۡا کَآفَّۃً ؕ فَلَوۡ لَا نَفَرَ مِنۡ کُلِّ فِرۡقَۃٍ مِّنۡہُمۡ طَآئِفَۃٌ لِّیَتَفَقَّہُوۡا فِی الدِّیۡنِ وَلِیُنۡذِرُوۡا قَوۡمَہُمۡ اِذَا رَجَعُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ لَعَلَّہُمۡ یَحۡذَرُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾﴾ (التوبة)

''اور سب کے سب مسلمان تو سفر کر کے (مدینہ) نہیں آ سکتے، اس لیے ہر قبیلہ سے ایک گروہ کو آنا چاہیے تاکہ وہ دین میں تفقہ حاصل کریں اور پھر واپس جا کر اپنی قوم کو متنبہ کریں تاکہ یہ لوگ بری باتوں سے بچیں۔''

اس سے مطلوب یہ تھا کہ ایک ایسی جماعت تیار ہو جائے جو شریعت کے اوامر ونواہی سے کماحقہ آگاہ ہو اور کردار و عمل کے اعتبار سے تعلیم نبویؐ کا ایک خوبصورت نمونہ ہو۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ''عرب کے ہر قبیلہ کا ایک گروہ حضور نبی کریم ﷺ کے پاس جاتا تھا اور آپؐ سے مذہبی امور دریافت کرتا تھا اور دین میں تفقہ حاصل کرتا تھا''۔ (تفسیر خازن)

مدینہ منورہ میں تعلیم وارشاد کے مختلف طریقے رائج تھے۔ یہاں عارضی طور پر ورکشاپس کی طرز پر ماہانہ اور کبھی دو دو ماہ کے کورس منعقد کیے جاتے تھے اور ان میں عقائد اور فقہ کے ضروری مسائل سکھائے جاتے تھے؟ اور پھر یہی لوگ جو باہر سے مرکز تعلیم میں مختصر عرصہ کے لیے تشریف لاتے تھے' واپس جا کر قبیلے کے باقی لوگوں کو تعلیم سے آراستہ کرتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ اُن سے فرماتے تھے کہ اپنے خاندان میں واپس جاؤ' ان میں رہ کر اُن کو اوامر شریعت کی تعلیم دو اور جس طرح مجھ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھو۔

اس کے علاوہ تعلیم کا ایک مستقل طریقہ بھی موجود تھا۔ صُفّہ کی درس گاہ ایسے ہی لوگوں کے لیے تھی جس میں لوگ اقامت اختیار کیے رکھتے تھے اور عقائد' شریعت' اخلاق' ابتدائی ریاضی اور لکھنے پڑھنے کی تعلیم پاتے تھے۔ اس درس گاہ میں نبی اکرم ﷺ خود بھی تعلیم دیتے تھے اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی تدریس پر مامور تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''میں نے اصحابِ صُفّہ میں سے چند لوگوں کو قرآن مجید اور لکھنے کی تعلیم دی۔ اس کے صلہ میں مجھ کو ایک شخص نے ایک کمان تحفہ میں دی''۔

حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اصحابِ صُفّہ'' میں سے ستر اشخاص رات کو ایک معلم کے پاس جاتے تھے اور صبح تک درس میں مشغول رہتے تھے''۔ (سیرت النبیؐ از شبلی)

صُفّہ کا یہ مدرسہ مسجد نبویؐ میں قائم تھا۔ اسی روایت کو اہل ایمان نے ہر جگہ جہاں بھی وہ گئے' زندہ رکھا۔ جابجا مساجد تعمیر کیں اور ان میں اسلامی تعلیمات کے فروغ کا اہتمام کیا' تاکہ ایک طرف تسبیح وتقدیس اور ذکر واذکار کا عمل جاری رہے اور دوسری طرف یہ مساجد اور درس گاہیں اتحاد و یگانگت اور مودّت وموانست کا باعث بنتی رہیں۔ انفرادی تزکیہ کا انصرام بھی ہوتا رہے اور اجتماعی تصفیہ وتطہیر کے عمل کے ذریعے ایک صالح معاشرہ کی تشکیل وتعمیر بھی ہوتی رہے۔ خلفاء راشدین اور بعد کے ادوار میں انہی ارفع مقاصد کے لیے مختلف ممالک میں مساجد و مدارس کا تسلسل قائم رہا۔ برصغیر میں بھی ہزاروں کی تعداد میں ابتدائی' وسطانی

اور ہائر ایجوکیشن کے لیے مساجد کے ساتھ مدارس تعمیر ہوئے جہاں کی تعلیم وتربیت نے بڑے بڑے عظیم سکالرز پیدا کیے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ضرورت اس امر کی تھی کہ تعلیم کا ایسا نظام وضع کیا جاتا جو جدید و قدیم کے حسین امتزاج کے ساتھ نشو ونما پاتا' مگر یہاں انگریزی مدارس کی سرپرستی کی گئی اور دینی درس گاہوں کو اس سرپرستی سے محروم رکھا گیا۔ اگر جدید مدارس میں اسلامی نظامِ تعلیم کی روشنی میں تعلیم کے تمام تر خدوخال کو اُبھارا جاتا اور قرآن وسنت کی تعلیمات کے نقوش کو تابندہ کرنے کی کاوشیں بروئے کار لائی جاتیں تو ملک کا نقشہ مختلف ہوتا' نہ تو فرقہ واریت کا شکوہ کیا جاتا اور نہ انتہا پسندی اور رجعت پسندی جیسی اصطلاحات کی رٹ لگانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ لیکن یہاں اسلامی تشخص کو اجاگر کرنے کی بجائے سیکولر تشخص کو عام کیا گیا' نظریۂ پاکستان کو لادینی کی راہ پر چڑھانے کی شعوری کوشش کی گئی' روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے فلسفے کو میراتھن اور بسنت کے تہواروں سے نتھی کیا گیا' بے پردگی اور فحاشی وعریانی کو جدیدیت ظاہر کر کے اہل اسلام کی اصل پہچان کو گم کرنے کی دانستہ سعی کی گئی۔ نتیجہ ظاہر تھا کہ آدھا تیتر آدھا بٹیر کی سی کیفیت رونما ہوگئی۔ مسلمانوں کی اکثریت قول کے اعتبار سے مسلمان رہی اور عملاً تہذیب مغرب کی نقال بن کر رہ گئی۔ یہ صورت حال دل خراش بھی ہے اور روح فرسا بھی کہ ہم اپنی شناخت کا تحفظ بھی نہ کر سکیں۔

ہمارے ہاں کے تعلیمی ادارے' مثلاً سکول' کالج اور یونیورسٹیاں جو سرکاری سرپرستی میں چل رہے ہیں' ان میں سے اکثر کی حالت ناگفتہ بہ اور مایوس کن ہے۔ نظم وضبط کی چولیں ڈھیلی پڑ چکی ہیں۔ اساتذہ کی اکثریت نہ صرف فرض ناشناس ہے' بلکہ دیگر دھندوں میں مصروف ہے۔ کسی کو سیاست کی چاٹ لگ گئی ہے اور کسی کو صحافت کا چسکا پڑا ہوا ہے' ٹیوشن کی وبا تو عام ہو چکی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تدریس کا عمل پھیکا پڑ گیا ہے اور نمود ونمائش کا رنگ خاصا شوخ ہو گیا ہے۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کا رنگ روپ اتنا نمایاں ہو گیا ہے کہ انہوں نے عام کھاتے پیتے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی ہے' اور وہ مقابلتاً نتائج بھی بہتر دکھا رہے ہیں۔ سرکار نے اپنی سرکردگی میں چلنے والے اداروں کا نوٹس لینے کی زحمت تو کم گوارا کی ہے' مگر عشر' خیرات اور صدقات کے بل بوتے پر چلنے والے مدرسوں کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئی ہے۔ اسے اِن درس گاہوں میں انتہا پسندی کے جرثومے دکھائی دینے لگے ہیں۔ حالانکہ ان مدرسوں میں صرف ونحو' فقہ' عربی ادب' منطق اور حدیث پڑھائی جاتی ہے۔ حفظ وتجوید

کے شعبے میں تلاوتِ قرآن کی صحت پر زور دیا جاتا ہے۔ مزید برآں قرآن کی تفسیر کا اسلوب سکھایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث کے متنوع موضوعات جن میں جہاد اور قتال بھی شامل ہیں، پر بھی گفتگو کی جاتی ہے، مگر ایسا ہرگز نہیں کہ طلبہ کو تشدد پر اُبھارا جاتا ہو اور انہیں خلافِ اسلام حرکات کی ترغیب دی جاتی ہو۔

جہاں تک دینی اداروں کے نصاب کا تعلق ہے کہ اس میں کس قسم کی تبدیلی درکار ہے، تو یہ ایک الگ موضوع ہے۔ علماء کی مشاورت سے نصاب، اس کے دورانیے اور طریق ہائے تدریس میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ اس نصاب کو ملک کی ضروریات کے مطابق سادہ، سہل اور آسان بنایا جاسکتا ہے۔ نصابی کتب کو ملک کی ضروریات کے مطابق اردو زبان کے قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے، صرف ونحو کی تدریس کے جدید طریقے اپنائے جاسکتے ہیں اور عربی و فارسی کو بطور زبان الگ سے پڑھایا جاسکتا ہے، تاکہ طلبہ پر بوجھ کم سے کم ہو، اور وہ کسی دوسری زبان کی بھول بھلیوں میں کھو جانے کے بجائے اصل ہدف اور مقصود پر توجہ مرکوز کیے رکھیں اور وسائل کو مقصود نہ بنالیں اور اپنی تمام تر توجہ قرآن وحدیث کی تعلیمات پر مرکوز کیے رکھیں۔ لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں کہ جہاد وقتال کی آیات کے مفہوم کو مسخ کر دیا جائے، اس کے احکامات کو من مانے معانی پہنائے جائیں اور اخلاقیات کی اسلامی تعلیمات اور مقرر کردہ حدود کو لبرل ازم کی سان پر چڑھا کر اپنی خواہشات کی تکمیل کی جائے۔ دینی درسگاہوں کے طلبہ کو جدید علوم سے متعارف کرانے میں کوئی قباحت نہیں، مگر اس کا طریق کیا ہو تاکہ دینی اداروں کے اصل اہداف پس منظر میں نہ چلے جائیں، اس پر خاص سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ یہ کام اتنا سہل اور آسان نہیں کہ عجلت میں کوئی قدم اٹھا لیا جائے۔ دھیرے دھیرے اور تدریج کے ساتھ اس مقصد کی طرف بڑھا جائے اور ملک کے بعض مدارس میں جو تجربات کیے جارہے ہیں ان کے ثمرات کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔ مگر یہ کام علماء خود کریں نہ کہ باہر سے کوئی بات ان کے سر تھوپ دی جائے۔ ہمارے حکمرانوں کو جارحانہ انداز اپنانے کے بجائے موزوں مشاورت کے ساتھ مثبت طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

ooo

مسلمان کا طرزِ حیات (۴۹)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق کتاب

"مِنهاجُ المسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب العبادات

دسواں باب

ا

زکوۃ

① زکوٰۃ کا حکم، حکمت اور زکوٰۃ نہ دینے والے کا حکم

ا) زکوٰۃ کا حکم

زکوٰۃ ہر اُس مسلمان پر فرض ہے جس کی ملکیت میں کسی قسم کا مال شروط کے مطابق بقدرِ نصاب موجود ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی فرضیت کا حکم نازل کیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا﴾(التوبة:۱۰۳)

''(اے نبیؐ!) ان کے مالوں سے صدقہ وصول کیجیے، اس کے ذریعے ان کو پاک کیجیے اور ان کا تزکیہ کیجیے۔''

نیز ارشاد ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ص﴾ (البقرة:۲٦۷)

''اے مؤمنو! ان پاک چیزوں سے خرچ کرو جو تم نے کمائیں اور جو ہم نے تمہارے

لیے زمین سے نکالیں۔''

اور فرمایا:

﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾(المزّمّل: ۲۰)

''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔''

جناب رسول اللہﷺ نے فرمایا:

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ : شَھَادَۃِ اَنْ لاَ اِلٰـــہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکَاۃِ وَحَجّ الْبَیْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ))[1]

''اسلام کو پانچ چیزوں پر تعمیر کیا گیا ہے: اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔''

اور فرمایا:

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْھَدُوْا اَنْ لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ' وَیُقِیْمُوا الصَّلَاۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکَاۃَ' فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَ ھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ اِلاَّ بِحَقّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ))[2]

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ لا الٰہ الاّ اللہ اور محمدؐ رسول اللہ کی گواہی دیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب انہوں نے یہ کام کر لیے تو مجھ سے اپنے خون اور مال محفوظ کر لیے' مگر اسلام کے حق کے ساتھ[3] ' اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔''

نبی کریمﷺ نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو انہیں نصیحت کرتے

الایمان' باب بیان ارکان الاسلام و دعائمه العظام۔

۲) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب فان تابوا واقاموا الصلاۃ وآتوا الزکاۃ فخلوا سبیلھم۔وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا لا اله الا الله محمد رسول الله۔

۳) مثلاً قتل کی سزا میں قتل کرنا یا قاتل کا مقتول کے وارثوں کو دیت دینا۔ اور دیگر اسلامی قوانین کے مطابق مسلمان ہونے کے بعد بھی ان کی جان اور مال میں تصرّف کیا جائے گا۔

۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب بنی الاسلام علی خمس۔ وصحیح مسلم' کتاب

ہوئے فرمایا:

((اِنَّکَ تَـأْتِیْ قَوْمًا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ فَادْعُھُمْ اِلٰی شَھَادَۃِ اَنْ لاَ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ‘ فَاِنْ ھُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِکَ فَاَعْلِمْھُمْ اَنَّ اللّٰہَ افْتَرَضَ عَلَیْھِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ وَلَیْلَۃٍ‘ فَاِنْ ھُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِکَ فَاَعْلِمْھُمْ اَنَّ اللّٰہَ افْتَرَضَ عَلَیْھِمْ صَدَقَۃً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِھِمْ فَتُرَدُّ فِیْ فُقَرَائِھِمْ. فَاِنْ ھُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِکَ فَاِیَّاکَ وَکَرَائِمَ اَمْوَالِھِمْ وَاتَّقِ دَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ‘ فَاِنَّـہٗ لَیْسَ بَیْنَھَا وَبَیْنَ اللّٰہِ حِجَابٌ))(٤)

’’آپ اہل کتاب لوگوں کے پاس جا رہے ہیں تو انہیں دعوت دینا کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں (محمدﷺ) اللہ کا رسول ہوں۔ جب وہ (آپ کی) یہ بات مان لیں پھر انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جب وہ آپ کی یہ بات مان لیں تو پھر انہیں بتانا کہ اللہ نے ان کے مالوں میں صدقہ فرض کیا ہے جو اُن کے امیروں سے لے کر واپس ان کے غریبوں کو دے دیا جائے گا۔ اگر وہ آپ کی یہ بات مان لیں تو ان کے اعلیٰ مال (بطور زکوٰۃ) وصول نہ کرنا‘ اور مظلوم کی بددعا سے بچ کر رہنا‘ کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔‘‘

ب) زکوٰۃ کی حکمت

زکوٰۃ کے مشروع ہونے کی بعض حکمتیں درج ذیل ہیں:

۱) نفسِ انسانی کو بخل اور حرص جیسی بری خصلتوں سے پاک کرنا۔

۲) غریبوں سے ہمدردی اور جسمانی طور پر معذور یا مصیبت زدہ اور محرومین کی حاجت روائی۔

۳) عوامی ضرورت کی اشیاء کی فراہمی (مثلاً پُل‘ سڑکیں وغیرہ) جن پر قوم کی زندگی اور فلاح کا دارومدار ہے۔

۴) اہل ثروت‘ تجار اور صنعت کار افراد کے پاس دولت کے ارتکاز کو روکنا تاکہ اموال ایک خاص طبقہ میں نہ سمٹ آئیں۔

---

٤) صحیح البخاری‘ کتاب الزکاۃ‘ باب اخذ الصدقۃ من الاغنیاء وترد فی الفقراء حیث کانوا (نحوہ)۔ وصحیح مسلم ‘کتاب الایمان‘ باب الدعاء الی الشھادتین و شرائع الاسلام۔

ج) زکوٰۃ نہ دینے والے کا حکم

جو شخص زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کرتے ہوئے زکوٰۃ نہ دے وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے' اور جو شخص فرضیت کا اقرار تو کرے لیکن بخل کی وجہ سے زکوٰۃ نہ دے' وہ گناہ گار ہے۔ اسلامی حکومت اُس سے زبردستی زکوٰۃ وصول کرنے کی مجاز ہے' اس کے علاوہ اسے کوئی دوسری سزا بھی دی جاسکتی ہے' حتیٰ کہ اگر اس سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے قتال بھی کرنا پڑے (یعنی پولیس مقابلہ کی نوبت آ جائے) تو اُس سے قتال کیا جائے گا' حتیٰ کہ وہ اللہ کا حکم تسلیم کر کے زکوٰۃ ادا کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَـوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُـكُمْ فِى الدِّيْنِ﴾ (التوبة: ١١)

''پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں۔''

اس کے علاوہ ارشادِ نبویؐ ہے:

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ' فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّىْ دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ))(٥)

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ لا الٰہ الاّ اللہ اور محمدؐ رسول اللہ کی گواہی دیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب انہوں نے یہ کام کر لیے تو مجھ سے اپنے خون اور مال محفوظ کر لیے' مگر اسلام کے حق کے ساتھ' اور اُن کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ نہ دینے والوں سے جنگ کے موقع پر فرمایا تھا:

وَاللّٰهِ لَوْ مَنَعُوْنِىْ عَنَاقًا كَانُوْا يُؤَدُّوْنَـهَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لَـقَاتَلْتُهُمْ عَلٰى مَنْعِهَا(٦)

---

٥) صحيح البخارى' كتاب الايمان' باب فان تابوا واقاموا الصلوة وآتوا الزكوة فخلوا سبيلهم۔ وصحيح مسلم' كتاب الايمان' باب الامر بقتال الناس حتى يقولوا لا اله الا الله محمد رسول الله۔

٦) صحيح البخارى' كتاب الزكاة' باب وجوب الزكاة۔

''اللہ کی قسم! اگر وہ مجھ سے ایک میمنا بھی روکیں گے جو وہ رسول اللہ ﷺ کو ادا کرتے تھے تو میں اس کی وجہ سے بھی ان سے جنگ کروں گا۔''

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس موقف سے اتفاق کیا اور اس پر اُن کا اِجماع ہوگیا۔

② جن مالوں میں زکوٰۃ ہے اور جن میں نہیں

ا) نقدین

سونا' چاندی اور سامانِ تجارت جن کی قیمت سونے چاندی کے دینار و درہم میں لگائی جاتی ہے' اور جو ان کے ساتھ ملحق ہیں' مثلاً معدن اور رِکاز[7] اور سونے چاندی کے قائم مقام بننے والے کرنسی نوٹ' سب پر زکوٰۃ فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيۡنَ يَكۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَالۡفِضَّةَ وَلَا يُنۡفِقُوۡنَهَا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۝٣٤﴾ (التوبة)

''اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' انہیں دردناک سزا کی خوشخبری دے دیجیے۔''

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيۡسَ فِيۡمَا دُوۡنَ خَمۡسِ اَوَاقٍ صَدَقَةٌ))[8]

''پانچ اوقیہ[9] سے کم (چاندی) میں زکوٰۃ نہیں''۔

نیز فرمایا:

((اَلۡعَجۡمَاءُ جُبَارٌ وَالۡبِئۡرُ جُبَارٌ وَالۡمَعۡدِنُ جُبَارٌ وَفِى الرِّكَازِ الۡخُمُسُ))[10]

''جانور کی وجہ سے آ جانے والے زخم کا قصاص نہیں' اور کنوئیں (کی وجہ سے آ جانے والی چوٹ) کا قصاص نہیں' اور کان (میں گر کر آ جانے والی چوٹ) کا قصاص نہیں'

---

۷) قدیم زمانے کا زمین میں مدفون مال' جس کے مالک کا پتا نہ لگ سکے' وہ جسے ملے اسی کا ہے۔

۸) صحیح البخاری' کتاب الزکاۃ' باب ما اُدِّیَ زکاتُہ فلیس بکنز۔ وصحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' حدیث اول۔

۹) ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا ہے اور درہم کا وزن تقریباً ساڑھے تین گرام کے برابر ہے۔

۱۰) صحیح البخاری' کتاب الزکاۃ' باب فی الرکاز الخمس۔

اور رِکاز میں پانچواں حصہ (زکوٰۃ) ہے۔''

ب) مویشی

مویشیوں میں اونٹ' گائے اور بھیڑ بکریاں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ﴾(البقرۃ:۲۶۷)

''اے مؤمنو! ان پاک چیزوں سے خرچ کرو جو تم نے کمائیں''۔

ایک شخص نے آنحضرتﷺ سے ہجرت کر آنے کے متعلق سوال کیا تو حضورﷺ نے فرمایا:

((وَیْحَکَ اِنَّ شَاْنَھَا شَدِیْدٌ ' فَھَلْ لَکَ مِنْ اِبِلٍ تُؤَدِّیْ صَدَقَتَھَا؟)) قَالَ: نَعَمْ قَالَ: ((فَاعْمَلْ مِنْ وَرَاءِ الْبِحَارِ فَاِنَّ اللّٰہَ لَنْ یَتِرَکَ مِنْ عَمَلِکَ شَیْئًا))[11]

''تیرا بھلا ہو! اس کا معاملہ تو بہت سخت ہے (یہ بہت مشکل کام ہے)۔ تو کیا تیرے پاس اونٹ ہیں جن کی تو زکوٰۃ دیتا ہے؟'' اس نے عرض کی: جی ہاں۔ فرمایا: ''پھر سمندر پار (بیٹھ کر بھی) عمل کرتا رہ' اللہ تیرے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہیں کرے گا (پورا ثواب دے دے گا)۔''

نیز جناب رسول اللہﷺ نے فرمایا:

((وَالَّذِیْ لَا اِلٰـہَ غَیْرُہٗ (اَوْ کَمَا حَلَفَ) مَا مِنْ رَجُلٍ تَـکُوْنُ لَـہٗ اِبِلٌ اَوْ بَقَرٌ اَوْ غَنَمٌ لَا یُؤَدِّیْ حَقَّھَا اِلَّا اُتِیَ بِھَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَعْظَمَ مَا تَـکُوْنُ وَاَسْمَنَہٗ تَطَؤُہٗ بِاَخْفَافِھَا وَتَنْطَحُہٗ بِقُرُوْنِھَا کُلَّمَا جَازَتْ اُخْرَاھَا رُدَّتْ عَلَیْہِ اُوْلَاھَا حَتّٰی یُقْضٰی بَیْنَ النَّاسِ))[12]

''قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں' کوئی بھی شخص جس کے پاس اونٹ یا گائیں یا بکریاں ہوں اور وہ اُن کی زکوٰۃ نہ دیتا ہو' تو قیامت کے دن وہ (سب) جانور بہت بڑے اور موٹے تازے کر کے لائے جائیں گے اور وہ اُس شخص کو پاؤں سے رگیدیں گے اور سینگوں سے ماریں گے' جب آخری جانور گزر جائے گا تو پھر پہلا جانور آ جائے گا' (اسے یہی عذاب ہوتا رہے گا) حتیٰ کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے۔''

---

(۱۱) صحیح البخاری' کتاب الزکاۃ' باب زکاۃ الابل۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب المبایعۃ بعد فتح مکۃ علی الاسلام والجھاد والخیر۔

(۱۲) صحیح البخاری' کتاب الزکاۃ' باب زکاۃُ البقر۔

ج) غلہ اور پھل

غلہ سے مراد ہر وہ غذائی جنس ہے جسے ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً گندم' جو' چنا' مکئی' چاول' لوبیا اور مسور وغیرہ۔ اور پھل سے مراد کھجور' منقّہ اور زیتون ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (البقرۃ:۲۶۷)

''اے مومنو! ان پاک چیزوں سے خرچ کرو جو تم نے کمائیں اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالیں۔''

اور فرمایا:

﴿وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ (الانعام:۱۴۱)

''اس کی کٹائی کے دن اس کا حق ادا کرو۔''

اور جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ صَدَقَةٌ))[۱۳]

''پانچ وسق[۱۴] سے کم (غلہ) میں زکوٰۃ نہیں۔''

اور ارشادِ نبویؐ ہے:

((فِيْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُوْنُ اَوْ كَانَ عَثَرِيًّا الْعُشْرُ وَمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ))[۱۵]

''جس (فصل) کو آسمان سے (بارش کے ذریعے) اور چشموں سے پانی ملے یا جڑوں کے ذریعے پانی حاصل کر لیتی ہو اُس میں دسواں حصہ (زکوٰۃ) ہے اور جسے پانی مہیا کر کے سیراب کیا جائے اس میں بیسواں حصہ (زکوٰۃ) ہے''۔

د) جن مالوں میں زکوٰۃ فرض نہیں

مندرجہ ذیل قسم کے اموال زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں' ان میں زکوٰۃ فرض نہیں:

---

۱۳) صحیح البخاری' کتاب الزکاۃ' باب ما اُدِّیَ زکاتہ فلیس بکنز۔وصحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' الحدیث الاوّل۔

۱۴) وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے جس کے چار من بنتے ہیں اور پانچ وسق کے بیس من ہوتے ہیں۔

۱۵) صحیح البخاری' کتاب الزکاۃ ' باب العشر فیما یُسقٰی من ماء السماء و بالماء الجاری۔

۱) غلام‘ گھوڑے‘ گدھے اور خچر۔ کیونکہ آنحضرتﷺ نے فرمایا ہے:

((لَیْسَ عَلَی الْمُسْلِمِ فِیْ فَرَسِہٖ وَغُلَامِہٖ صَدَقَۃٌ))[۱۶]

''مسلمان پر اُس کے گھوڑے اور اس کے غلام میں صدقہ نہیں ہے۔''

اور آنحضرتﷺ سے ثابت نہیں کہ آپؐ نے کبھی خچروں اور گدھوں کی زکوٰۃ وصول فرمائی ہو۔

۲) جو مال نصاب سے کم ہو اُس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ البتہ اگر مالک نفلی طور پر صدقہ کرنا چاہے تو درست ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((لَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسَۃِ اَوْسُقٍ مِنَ التَّمْرِ صَدَقَۃٌ وَلَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسِ اَوَاقٍ مِنَ الْوَرِقِ صَدَقَۃٌ وَلَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِنَ الْاِبِلِ صَدَقَۃٌ))[۱۷]

''پانچ وسق سے کم کھجور میں صدقہ نہیں ہے‘ پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں صدقہ نہیں‘ اور پانچ سے کم اونٹوں میں صدقہ نہیں۔''

۳) پھل اور سبزیاں۔ کیونکہ ان کی زکوٰۃ کے متعلق جناب رسول اللہﷺ سے کوئی حدیث ثابت نہیں۔ البتہ ان میں سے کچھ نہ کچھ غریبوں اور پڑوسیوں کو دینا مستحب ہے۔ کیونکہ یہ ارشادِ خداوندی عام ہے کہ:

﴿اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾

(البقرۃ:۲۶۷)

''ان پاک چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم نے کمائیں اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالیں۔''

۴) عورتوں کے زیورات‘ جبکہ اُن سے صرف زینت مقصود ہو۔ اگر زینت کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی پیش نظر ہو کہ بوقتِ ضرورت کام آنے کے لیے ذخیرہ کیے گئے ہیں تو پھر اِن میں زکوٰۃ فرض ہو گی‘ کیونکہ یہ بھی اس سونے چاندی سے مشابہ ہو گئے جو صرف ذخیرہ کے طور

---

۱۶) صحیح البخاری‘ کتاب الزکاۃ‘ باب لیس علی المسلم فی فرسہ صدقۃ۔

۱۷) صحیح البخاری‘ کتاب الزکاۃ‘ باب لیس فیما دون خمس ذود صدقۃ۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الزکاۃ‘ باب اول (نحوہ) ۔

پر رکھا جاتا ہے۔[۱۸]

۵) قیمتی جواہرات مثلاً زمرد' یاقوت اور موتی وغیرہ۔ البتہ اگر وہ تجارت کے لیے رکھے گئے ہوں تو جس طرح دوسرے تجارتی سامان میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے' ان میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

٦) وہ سامان جو ذاتی استعمال کے لیے رکھا گیا ہو اور اس کی تجارت کا ارادہ نہ ہو' مثلاً بستر وغیرہ۔ اسی طرح مکان' کارخانہ اور گاڑی وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں' کیونکہ قرآن مجید یا حدیث شریف میں ان کی زکوٰۃ مذکور نہیں۔

③ زکوٰۃ کے لیے مختلف اموال کے نصاب اور اُن کی زکوٰۃ کی مقدار

(ا) سونا' چاندی اور وہ چیزیں جو سونے چاندی کے حکم میں ہیں

۱) سونا: اس میں زکوٰۃ واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ ایک سال تک مالک کے پاس رہا ہو' اور اس کی مقدار نصاب تک پہنچ جائے۔ اس کا نصاب بیس دینار ہے۔ اس میں سے چالیسواں حصہ ادا کرنا فرض ہے' یعنی بیس دینار میں سے آدھا دینار۔[۱۹] اگر سونا بیس دینار سے زیادہ ہو تو اسی حساب سے زائد سونے کی بھی زکوٰۃ دی جائے گی۔

---

۱۸) عورتوں کے زیورات کے بارے میں احتیاط کا تقاضا ہے کہ زکوٰۃ دی جائے' خواہ صرف زینت کے لیے ہی ہوں۔ امام حاکم نے مستدرک میں حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ میں چاندی کے کنگن دیکھے تو فرمایا: ''عائشہ! یہ کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ''میں نے اس لیے بنوائے ہیں کہ آپ کے لیے زینت کروں۔'' آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم ان کی زکوٰۃ دیتی ہو؟'' انہوں نے کہا: ''جی نہیں۔'' آپؐ نے فرمایا: ''جہنم میں جانے کے لیے یہی کافی ہے''۔ مستدرك حاكم' كتاب الزكاة' باب التغليظ فى منع الزكاة۔ امام حاکم نے فرمایا: یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے معیار کی ہے اور ان دونوں نے اسے روایت نہیں کیا۔

۱۹) دینار ساڑھے چار ماشہ سونے کا ہوتا ہے اور بیس دینار کی مقدار ساڑھے سات تولے ہوتی ہے۔ اس میں سے سوا دو ماشے زکوٰۃ ادا کی جائے۔ ماشہ تقریباً ایک گرام کے برابر ہوتا ہے۔

۲) چاندی: سونے کی طرح اس کی شرط بھی یہ ہے کہ اس پر سال گزرے اور نصاب کو پہنچے۔ چاندی کا نصاب دوسو درہم ہے۔ اس کی زکوٰۃ بھی چالیسواں حصہ ہے۔ دوسو درہم میں سے پانچ درہم [۲۰] اور زائد کی بھی اسی حساب سے زکوٰۃ دی جائے گی۔

۳): اگر کسی کے پاس تھوڑا سا سونا ہو جو نصاب سے کم ہو' اور تھوڑی سی چاندی ہو وہ بھی نصاب سے کم ہو اور دونوں کو ملانے سے نصاب پورا ہو جاتا ہو تو ان دونوں کی زکوٰۃ دینی چاہیے' کیونکہ نبیﷺ سے ایک روایت آتی ہے کہ آپؐ نے سونے اور چاندی کو باہم ملا کر ان کی زکوٰۃ نکالی۔ [۲۱] سونے کی زکوٰۃ چاندی میں سے اور چاندی کی سونے میں سے ادا کرنا بھی درست ہے۔ مثلاً اگر کسی کے ذمہ ایک دینار سونا بطور زکوٰۃ ہو تو وہ ایک دینار سونے کے بجائے دس درہم چاندی ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح چاندی کے بجائے سونا ادا کیا جا سکتا ہے۔ کاغذ کے نوٹوں کی زکوٰۃ بھی سونے چاندی کی طرح چالیسواں حصہ ادا کرنی چاہیے' کیونکہ حکومتوں کے ہاں نوٹوں کے بدلے سونا چاندی ادا کیا جاتا ہے۔

۴) سامانِ تجارت: ان میں سے کچھ تو وہ ہوتا ہے جسے موجودہ بھاؤ پر بھی بیچ دیا جاتا ہے اور بھاؤ بڑھنے کا انتظار نہیں کیا جاتا۔ اور کچھ وہ ہوتا ہے جسے بھاؤ بڑھنے کے انتظار میں روک کر رکھنا ممکن ہوتا ہے۔ تو اگر وہ سامان ساتھ کے ساتھ بکنے والا ہے تو سال کے آخر میں اس کی قیمت لگائی جائے۔ پھر اگر ان کی قیمت نصاب کو پہنچتی ہے یا وہ تو نصاب سے کم ہے' لیکن نقد رقم بھی موجود ہے جسے ملا کر نصاب پورا ہو جاتا ہے تو ان سب کی زکوٰۃ ڈھائی فی صد کے حساب سے ادا کی جائے گی۔ اور اگر سامانِ تجارت ذخیرہ کیا گیا ہے تو جب فروخت ہو جائے گا اس کی ایک سال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے گی' اگرچہ قیمت بڑھنے کے انتظار میں کئی سال اس کے پاس پڑا رہا ہو۔

۵) قرض: جس نے کسی کو قرض دیا ہوا ہو' اور وہ اُس سے جب چاہے واپس لے سکتا ہو' تو اس قرض کو اپنے پاس موجود سونے چاندی یا سامانِ تجارت میں شمار کرے اور سال پورا ہونے پر اُس کی زکوٰۃ دے۔ اگر کسی کے پاس نقد رقم نہ ہو' صرف اس کے قرض ہی دوسروں

---

۲۰) درہم کا وزن ساڑھے تین ماشہ ہے۔ دوسو درہم کی ساڑھے باون تولے چاندی بنتی ہے۔

۲۱) امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے۔ علمائے مالکیہ نے بکر بن عبداللہ بن اشج سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''سنت یہی چلی آ رہی ہے کہ نبیﷺ نے سونے کو چاندی کے ساتھ اور چاندی کو سونے کے ساتھ ملا کر ان کی زکوٰۃ نکالی''۔

کے ذمے ہوں' اوران قرضوں کی مقدار نصاب کو پہنچتی ہو' تو وہ ان کی بھی زکوٰۃ ادا کرے۔
جس نے کسی تنگ دست آدمی کو قرض دیا ہوا ہو' اور اس سے جب چاہے اسی وقت نہ وصول کر سکتا ہو' تو جب یہ قرض اسے واپس ملے اس وقت اس کی ایک سال کی زکوٰۃ ادا کرے' اگرچہ مقروض کے پاس وہ قرض کئی سال رہا ہو۔

٦) رِکاز: یعنی زمانۂ جاہلیت کا دفن شدہ مال. جس شخص کو اپنی زمین یا اپنے گھر میں جاہلیت کے زمانے کا دفن شدہ مال ملے' اس پر فرض ہے کہ زکوٰۃ کے طور پر اس کا پانچواں حصہ غریبوں اور مسکینوں کو دے اور خیراتی پروگراموں میں خرچ کرے۔ کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

((فِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ)) (٢٢)

''مدفون مال میں پانچواں حصہ ہے۔''

٧) معدن: اگر کسی کے پاس سونے یا چاندی کی کان ہو' تو اُس میں سے نکلنے والی دھات کی زکوٰۃ ادا کرے' بشرطیکہ وہ نصاب کو پہنچ جائے' خواہ سال گزرا ہو یا نہ گزرا ہو' بلکہ جب بھی کچھ سونا چاندی نکالے' جب وہ نصاب تک پہنچے' اس کی زکوٰۃ دے دے۔ علمائے کرام اس مسئلہ میں مختلف آراء رکھتے ہیں کہ زکوٰۃ میں چالیسواں حصہ ادا کرنا چاہیے جو سونے چاندی کی زکوٰۃ کی شرح ہے' یا رِکاز کی طرح پانچواں حصہ ادا کیا جائے۔ جو حضرات پانچواں حصہ ادا کرنے کے قائل ہیں وہ معدن کو رِکاز پر قیاس کرتے ہیں اور جو حضرات چالیسواں حصہ ادا کرنے کا فتویٰ دیتے ہیں وہ اس حدیث کے عموم سے استدلال کرتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

((وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ اَوَاقٍ صَدَقَةٌ))

''اور پانچ اوقیہ سے کم میں زکوٰۃ نہیں''۔

اور پانچ اوقیہ میں معدن بھی شامل ہے اور دوسری صورتیں بھی۔ بہرحال اس مسئلہ میں گنجائش ہے۔ والحمدللہ!

اگر وہ کان سونے چاندی کے سوا کسی اور دھات کی ہے' مثلاً لوہا' تانبا' گندھک وغیرہ' تو جتنی دھات نکلے اس کی قیمت کا ڈھائی فیصد ادا کر دینا مستحب ہے۔ اس کے متعلق

---

٢٢) صحیح البخاری' کتاب المساقاۃ' باب من حفر بئرا فی ملکه لم یضمن۔ و صحیح مسلم' کتاب الحدود' باب جرح العجماء والمعدن والبئر جبار۔

کوئی صریح نص موجود نہیں اور چونکہ یہ سونا چاندی نہیں ہے اس لیے وجوب کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔

۸) مالِ مستفاد: یعنی سال کے دوران حاصل ہونے والا مال۔ اگر یہ مال تجارت سے حاصل ہونے والا منافع ہے یا جانوروں نے بچے دیے ہیں' تو جب اصل مال کی زکوٰۃ دی جائے گی اسی کے ساتھ اس زائد مال کی زکوٰۃ بھی ادا کی جائے گی۔ اس میں سال پورا ہونے کی شرط کو ملحوظ نہیں رکھا جائے گا۔ اور اگر حاصل ہونے والا یہ مال نہ تجارت کا نفع ہے نہ حیوانات کی افزائش نسل' تو پھر اس مال کا سال اس وقت سے شروع ہوگا جب وہ حاصل ہوا۔ اس پر سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ دی جائے گی۔ مثلاً کسی کو وراثت میں یا بطورِ ہبہ کوئی مال حاصل ہو گیا تو اس کی زکوٰۃ اس وقت دے گا جب اس کے حصول پر سال گزر جائے گا۔

ب) مویشی

ان میں اونٹ' گائیں اور بکریاں شامل ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱) اونٹ: ان کی زکوٰۃ کی شرط یہ ہے کہ سال پورا ہو جائے اور نصاب کو پہنچ جائیں۔ ان کا نصاب یہ ہے کہ ان کی تعداد پانچ یا زیادہ ہو۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((وَلَـيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِنَ الْإِبِلِ صَدَقَةٌ))[۲۳]

''اور پانچ سے کم اونٹوں پر صدقہ نہیں ہے۔''

پانچ اونٹوں پر بطور زکوٰۃ ایک بکری یا بھیڑ[۲۴] ادا کرنا واجب ہے جس کی عمر ایک سال کی ہو چکی ہو' اور وہ دوسرے سال میں ہو۔ اور وہ بکری اس قسم کی ہو جس طرح کی بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ میں عام طور پر ادا کی جاتی ہے۔ دس اونٹوں پر دو بکریاں ادا کی جائیں۔ پندرہ اونٹوں کی زکوٰۃ تین بکریاں اور بیس اونٹوں کی زکوٰۃ چار بکریاں ہیں۔ پچیس اونٹوں پر ایک بنتِ مَخَاض ـــــ یعنی ایک سالہ اونٹنی ـــــ ادا کرنی چاہیے۔ اگر ریوڑ میں بنتِ مَخَاض موجود نہ ہو تو ابنِ لَبُون ـــــ یعنی دو سالہ اونٹ ـــــ ادا کیا جا سکتا ہے۔ جب تعداد چھتیس ہو جائے تو ایک بنتِ لَبُون یعنی دو سالہ اونٹنی دینا ہوگی۔ جب اونٹوں کی تعداد چھیالیس ہو جائے تو ایک حِقّہ ادا کی جائے گی' یعنی وہ اونٹنی جو تین سال کی ہو کر چوتھے سال میں لگ گئی ہو۔

---

۲۳) صحیح البخاری' کتاب الزکاۃ' باب لیس فیما دون خمس ذود صدقۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب اوّل۔

۲۴) حدیث میں ''شاۃ'' کا لفظ ہے' جو بکری اور بھیڑ دونوں پر بولا جاتا ہے۔

اکسٹھ اونٹوں میں سے ایک جَذعہ اونٹنی بطورِ زکوٰۃ دی جائے گی' یعنی جو چار سال پورے کر کے پانچویں سال میں داخل ہو چکی ہو۔ جب تعداد چھہتر ہو جائے تو دو بنتِ لبون ادا کرنا ہوں گی۔ اور جب یہ اکانوے ہو جائیں تو دو حِقّہ اونٹنیاں ادا کی جائیں گی۔ اور جب ایک سو بیس ہو جائیں تو ہر چالیس پر ایک بنتِ لبون یا ہر پچاس پر ایک حِقّہ ادا کی جائے گی۔

نوٹ: جس شخص کے ذمہ ایک خاص عمر کی اونٹنی ادا کرنا ہو' اور اس عمر کی اونٹنی اس کے پاس موجود نہ ہو لیکن اس سے کم عمر کی اونٹنی موجود ہو تو وہی دے دے اور کمی پوری کرنے کے لیے دو بکریاں دے دے یا بیس درہم ادا کر دے۔ اگر اس کے پاس مطلوبہ عمر سے زیادہ عمر کی اونٹنی ہو تو زکوٰۃ وصول کرنے والا اسے دو بکریاں دے یا بیس درہم ادا کرے۔ البتہ بنتِ مَخاض (ایک سالہ اونٹنی) کے بجائے ابنِ لبون (دو سالہ اونٹ) ادا کرے تو اس کے ساتھ بکریاں یا اُن کی قیمت نہ دے۔ جیسے کہ پہلے بیان ہوا۔

۲) بیل اور گائیں: ان میں بھی اونٹوں کی طرح سال گزرنے اور نصاب مکمل ہونے کی شرط ہے۔ ان کا نصاب تیس عدد گائے بیل ہیں۔ جب یہ نصاب پورا ہو جائے تو ایک سال کی عمر کا ایک بچھڑا بطور زکوٰۃ ادا کرنا ہو گا۔ اگر تعداد چالیس تک پہنچ جائے تو ایک مُسنّہ یعنی دو سال کی عمر کا بچھڑا زکوٰۃ ہو گی۔ اس سے زیادہ ہوں تو ہر چالیس پر مُسنّہ اور ہر تیس پر ایک سالہ بچھڑا ہو گا۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((فِیْ کُلِّ ثَلَاثِیْنَ تَبِیْعٌ وَفِی الْاَرْبَعِیْنَ مُسِنَّـةٌ))(۲۵)

''ہر تیس میں بچھڑا ہے اور چالیس میں مُسِنّہ (دو دانت جانور)۔''

۳) بکریاں اور بھیڑیں: ان کی شرط بھی سال گزرنا اور نصاب پورا ہونا ہے۔ اس کا نصاب چالیس بھیڑ بکریاں ہیں۔ ان میں سے ایک بکری ادا کی جائے گی۔ جب ان کی تعداد ایک سو اکیس ہو جائے تو دو بکریاں ادا کرنا ہوں گی۔ جب دو سو ایک ہو جائیں تو زکوٰۃ کی مقدار تین بکریاں ہوں گی۔ اگر تین سو سے زیادہ ہوں تو ہر سو پر ایک بکری زکوٰۃ ہو گی۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((فَاِذَا زَادَتْ عَلٰی ثَلَاثِ مِائَةٍ فَفِیْ کُلِّ مِائَةٍ شَاةٌ)) (۲۶)

''پس جب یہ تین سو سے زیادہ ہوں تو ہر سو میں ایک بکری ہے۔''

---

۲۵) سنن ابی داوٗد' کتاب الزکاۃ' باب زکاۃ السائمۃ (نحوہ)۔ وجامع الترمذی' کتاب الزکاۃ عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی زکاۃ البقر۔

۲۶) صحیح البخاری' کتاب الزکاۃ' باب زکاۃ الغنم۔

نوٹ :

۱) اکثر علماء کے نزدیک مویشیوں میں زکوٰۃ فرض ہونے کی یہ شرط ہے کہ وہ سال کا اکثر حصہ جنگل میں چُر چُگ کر پیٹ بھرتے ہوں (اور ان کے لیے مالک کو چارہ مہیا نہ کرنا پڑے)۔ امام مالکؒ اسے شرط قرار نہیں دیتے۔ امام مالکؒ کے زمانے میں اہل مدینہ کا یہی عمل تھا۔(۲۷)

جمہور علماء کی دلیل جناب رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

((وَفِیْ سَائِمَۃِ الْغَنَمِ اِذَا کَانَتْ اَرْبَعِیْنَ فَفِیْھَا شَاۃٌ اِلٰی عِشْرِیْنَ وَمِائَۃٍ))(۲۸)

''چرنے والی بکریوں میں جب وہ چالیس ہو جائیں تو ایک بکری (زکوٰۃ) ہے اور وہ ایک سو بیس (بکریوں) تک (ایک ہی بکری ہے)۔''

جمہور نے ''چرنے والی بکریاں'' کے لفظ کو بکریوں میں اس شرط کے لیے نصاً دلیل قرار دیا ہے' اور اونٹوں اور گایوں کو بکریوں پر قیاس کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چارہ مہیا کرنے کی مشقت اور خرچ کا تقاضا ہے کہ چرنے کی شرط کا لحاظ رکھا جائے۔

۲) ایک نصاب سے دوسرے نصاب تک کی درمیانی تعداد کو ''وقص'' کہا جاتا ہے۔ مویشیوں کے وقص میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ مثلاً جس کے پاس چالیس بکریاں ہیں اس پر ایک بکری بطورِ زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ چالیس سے زیادہ جتنی بھی ہوں ان پر زکوٰۃ نہیں ہوگی' حتیٰ کہ ان کی تعداد ایک سو بیس ہو جائے۔ جب ایک سو بیس سے ایک بھی بکری زیادہ ہو جائے گی تو زکوٰۃ کی مقدار دو بکریاں ہو جائے گی۔ یعنی چالیس اور ایک سو بیس کے درمیان جو تعداد ہے وہ سب ''وقص'' ہے' اس میں کوئی زکوٰۃ نہیں۔

اونٹوں اور گایوں کے وقص کی مثال بھی اسی طرح سمجھ لی جائے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے بکریوں کی زکوٰۃ بیان کرتے ہوئے یوں فرمایا: ''جب فلاں تعداد کو پہنچ جائیں تو ان میں اتنی زکوٰۃ ہے''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو معین مقداروں کے درمیان کوئی زکوٰۃ نہیں۔

۳) زکوٰۃ دیتے وقت بھیڑوں کی گنتی بکریوں کے ساتھ ہی کرنا چاہیے' کیونکہ یہ دونوں

---

۲۷) اور امام مالک کے زمانے میں مدینہ کے علماء اکثر تابعین ہی تھے' جو امام مالکؒ کے اساتذہ ہیں۔

۲۸) سنن ابی داؤد' کتاب الزکاۃ' باب فی زکاۃ السائمۃ۔

جانور ایک ہی جنس شمار ہوتے ہیں۔اسی طرح بھینسیں بھی گایوں کے ساتھ شمار کی جائیں گی۔ اور عربی اونٹ اور بختی اونٹ ایک ہی جنس شمار ہوں گے۔ کیونکہ اس حدیثِ نبویؐ میں کہ ''چرنے والی بکریاں جب چالیس ہوں تو اُن میں ایک بکری ہے'' بکری کا لفظ بھیڑ پر بھی بولا گیا ہے۔اسی طرح یہ حدیث کہ ''پانچ اونٹوں میں ایک بکری (زکوٰۃ) ہے'' اس میں ہر قسم کا اونٹ شامل ہو جاتا ہے۔اسی طرح ''ہر تیس گایوں میں......'' سے مراد گائیں اور بھینسیں سبھی ہیں' کیونکہ یہ ایک ہی جنس میں شامل ہیں۔

۴) جب دو شخص بقدر نصاب بکریوں کے مالک ہوں' اور ان دونوں ریوڑوں کا چرواہا بھی ایک ہی ہو' اور دونوں ریوڑ ایک ہی چراگاہ میں چرتے ہوں اور رات کو ایک ہی جگہ رکھے جاتے ہوں تو ان آدمیوں کو ''خلیط'' کہا جاتا ہے۔زکوٰۃ کے موقع پر ان دونوں کا مال ایک ریوڑ کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی لحاظ سے اس میں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔مثلاً ایک آدمی کی چالیس بکریاں ہیں اور دوسرے کی اسّی بکریاں۔اور زکوٰۃ وصول کرنے والے نے ان میں سے ایک بکری وصول کر لی (کیونکہ ایک سو بیس پر ایک ہی بکری واجب ہے) اور وہ بکری چالیس بکریوں والے کی تھی۔اب اسّی بکریوں کا مالک دو تہائی (۲/۳) بکری کی قیمت چالیس والے کو دے گا۔البتہ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ محض زکوٰۃ سے بچنے کے لیے دو الگ الگ ریوڑوں کو ملا کر ایک کر لینا یا ایک ریوڑ کو تقسیم کر کے دو ریوڑ بنا لینا جائز نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے حکام کو جو تحریری ہدایات جاری فرمائی تھیں اس میں لکھا تھا:

لَا يُجْمَعُ بَيْنَ مُتَفَرِّقٍ وَلَا يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ' وَمَا كَانَ مِنْ خَلِيْطَيْنِ فَاِنَّهُمَا يَتَرَاجَعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَّةِ(۲۹)

''زکوٰۃ کے ڈر سے الگ الگ (ریوڑوں) کو جمع نہ کیا جائے اور اکٹھے (ریوڑ) کو الگ الگ نہ کیا جائے' اور جو زکوٰۃ دو خلیطوں سے لی جائے وہ آپس میں برابری کے ساتھ ایک دوسرے سے رجوع کر لیں۔''

۵) زکوٰۃ میں بکری کا میمنا' یا گائے کا چھوٹا بچھڑا' یا اونٹ کا چھوٹا بچہ وصول نہیں کیا جائے گا (بلکہ مقررہ عمر کا جانور وصول کیا جائے گا)' لیکن جانوروں کی گنتی کرتے ہوئے میمنے' بچھڑے اور اونٹوں کے بچے بھی شمار کیے جائیں گے۔حضرت عمر ؓ نے فرمایا تھا:

---

۲۹) صحيح البخاری' كتاب الزكاة' باب لا يجمع بين متفرق ولا يفرق بين مجتمع ـ وموطا مالك' كتاب الزكاة' باب صدقة الماشية۔

تَعُدُّ عَلَيُهِمُ بِالسَّخُلَةِ وَلَا تَاُخُذُهَا (۳۰)

''میمنے بھی (بکریوں میں) شمار کرو لیکن (زکوٰۃ کے طور پر) وصول نہ کرو۔''

۶) زکوٰۃ کے طور پر بوڑھا جانور قبول نہیں کیا جائے گا' نہ ایسا عیب دار جانور لیا جائے گا جس کی قیمت عیب کی وجہ سے کم ہوگئی ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لَا تُؤْخَذُ فِي الصَّدَقَةِ هَرِمَةٌ وَلَا ذَاتُ عَوَارٍ وَلَا تَيُسٌ (۳۱)

''زکوٰۃ میں بوڑھا یا عیب دار جانور یا سانڈ (جسے نسل کشی کے لیے ریوڑ میں رکھا جاتا ہے) نہیں لیا جائے گا۔''

اسی طرح اعلیٰ جانور نہیں لیا جائے گا' مثلاً وہ مادہ جو عنقریب بچہ جننے والی ہو' اور وہ مادہ جو اپنے بچے کو دودھ پلا کر پال رہی ہو' اور وہ بکری جسے گوشت کھانے کی نیت سے اہتمام کے ساتھ پال کر موٹا کیا گیا ہو' اور نسل بڑھانے کے لیے رکھا ہوا نر جانور۔ کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

((**فَإِيَّاكَ وَكَرَائِمَ أَمُوَالِهِمُ**))(۳۲) ''پس ان کے عمدہ مال نہ لینا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ وصول کرنے والے کو ہدایت کی تھی کہ کھانے کے لیے پالا ہوا جانور' یا دودھ کے لیے پالی ہوئی بکری اور وہ بکری جو عنقریب بچہ جننے والی ہو اور ریوڑ کا سانڈ زکوٰۃ میں وصول نہ کرنا۔ (۳۳)

ج) پھل اور غلہ

پھلوں اور غلہ میں زکوٰۃ فرض ہونے کی شرط یہ ہے کہ پھل رنگ بدل لے (۳۴) اور غلہ بھوسے سے الگ کر لیا جائے اور انگور اور زیتون استعمال کے قابل ہو جائیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

---

۳۰) موطا مالك' كتاب الزكاة' باب ما جاء فی ما يعتد من السخل فی الصدقة۔

۳۱) صحيح البخاری' كتاب الزكاة' باب لا يؤخذ فی الزكاة هرمة ولا ذات عوار ولا تيس الّا ماشاء المصدق۔

۳۲) صحيح البخاری' كتاب الزكاة' باب اخذ الصدقة من الاغنياء وترد فی الفقراء۔ وصحيح مسلم ' كتاب الايمان' باب الدعاء الى الشهادتين و شرائع الاسلام۔

۳۳) موطا مالك' كتاب الزكاة' باب ما جاء ما يعتد به من السخل فی الصدقة۔

۳٤) جس سے معلوم ہو کہ پھل پکنے والا ہے۔

﴿وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ (الانعام:۱۴۱)

''اس کی کٹائی کے دن اس کا حق ادا کرو۔''

اس کا نصاب پانچ وسق (یعنی بیس من) ہے۔ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور صاع چار مُدّ کا۔ارشادِ نبویؐ ہے:

((لَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ صَدَقَةٌ))[۳۵]

''پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔''

اس میں زکوٰۃ کی تفصیل یہ ہے کہ اگر فصل بغیر خرچ کے سیراب ہوتی ہو' مثلاً زمین سے خود ہی جڑوں کے ذریعے پانی لے لیتی ہو[۳۶] یا چشموں' قدرتی نالوں اور دریاؤں سے سیراب ہوتی ہو تو اس میں سے دسواں حصہ زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔یعنی پانچ وسق میں سے آدھا وسق (دو من)۔اور اگر خرچ کر کے سیراب کی جاتی ہو' مثلاً ڈول سے پانی نکال کر یا اونٹوں پر دُور سے پانی لا کر سیراب کی جاتی ہو تو اس میں بیسواں حصہ زکوٰۃ ہے۔[۳۷] یعنی پانچ وسق میں سے چوتھائی وسق (ایک من)۔جتنی پیداوار زیادہ ہو گی اسی حساب سے اس کی زکوٰۃ بھی زیادہ ہو جائے گی۔کیونکہ ارشادِ نبویؐ ہے:

((فِيْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُوْنُ اَوْ كَانَ عَثَرِيًّا الْعُشْرُ وَمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ))[۳۸]

''جو فصل بارش اور چشموں سے سیراب ہو یا زمین سے پانی کھینچ لینے والی ہو' اس میں دسواں حصہ ہے اور جسے پانی پہنچا کر سینچا جائے اس میں بیسواں حصہ ہے۔''

نوٹ:

۱) جو شخص فصل کو کبھی آلات سے (کنویں وغیرہ سے) پانی دیتا ہے' اور کبھی ان کے بغیر' تو اسے پیداوار کے دسویں حصے کا تین چوتھائی حصہ (یعنی ساڑھے سات فی صد) ادا کرنا چاہیے۔علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں: ''اس مسئلہ میں ہمیں علماء کے کسی اختلاف کا علم نہیں''۔

۲) اگر مختلف قسم کی کھجوریں ہوں' تو اگر ان سب کی مجموعی مقدار نصاب کو پہنچتی ہے تو

---

۳۵) صحیح البخاری' کتاب الزکاۃ' باب ما اُدّی زکاتہ فلیس بکنز۔وصحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب اوّل۔

۳۶) جیسے دریا کے قریب کی زمین میں فصل کو عام طور پر پانی دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

۳۷) تیل یا بجلی سے چلنے والے ٹیوب ویل سے آب پاشی کا بھی یہی حکم ہے۔

۳۸) صحیح البخاری' کتاب الزکاۃ' باب العشر فی ما یُسقٰی من ماء السماء وبالماء الجاری۔

زکوٰۃ ادا کی جائے (یعنی ہر قسم کا الگ الگ نصاب مکمل ہونا ضروری نہیں)' زکوٰۃ میں نہ تو بہترین قسم ادا کرنا ضروری ہے نہ ادنیٰ ترین قسم ادا کی جائے' بلکہ درمیانہ درجہ کی پیداوار میں سے زکوٰۃ کی مقررہ مقدار ادا کر دی جائے۔

۳) گندم' جو اور سلت (۳۹) کو ایک ہی جنس شمار کیا جائے۔ اگر ان کو ملا کر نصاب پورا ہو جائے تو زکوٰۃ میں وہ چیز ادا کر دی جائے جس کی مقدار زیادہ ہے۔

۴) مختلف قسم کی دالوں وغیرہ کی اجناس کو ایک جنس شمار کیا جائے' مثلاً چنا' مسور اور لوبیا وغیرہ کو ملا کر اگر نصاب پورا ہو جائے تو زیادہ مقدار والی جنس میں سے پوری زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ (۴۰)

۵) زیتون' سرسوں اور دوسری تیل نکالنے والی پیداوار جب نصاب کو پہنچ جائے تو اُس کے تیل میں سے زکوٰۃ ادا کی جائے۔

۶) مختلف قسم کے انگور اگر سب مل کر نصاب پورا کر دیں تو زکوٰۃ دی جائے۔ زکوٰۃ میں خشک انگور (منقہ' کشمش) ادا کی جائے۔ لیکن اگر انگور خشک ہونے سے پہلے بیچ دیے جائیں تو اُن کی قیمت میں سے دسواں یا بیسواں حصہ' جو بھی آبپاشی کے ذرائع کا لحاظ رکھتے ہوئے بنتا ہے' ادا کر دیا جائے۔

۷) چاول' مکئی اور دخن (۴۱) الگ الگ جنسیں ہیں۔ ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر نصاب پورا نہیں کیا جائے گا' بلکہ جس جنس کا نصاب پورا ہو گیا اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے اور جس کا نصاب پورا نہ ہوا' اس میں زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔

۸) اگر کسی سے زمین کرائے پر لے کر کاشت کی جائے اور پیداوار نصاب کو پہنچ جائے تو کاشت کار پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگی۔

۹) اگر کسی کو ہبہ' خریداری' یا وراثت یا کسی بھی ذریعہ سے غلہ یا پھل کی ملکیت حاصل ہو گئی اور اس وقت غلہ یا پھل میں وجوبِ زکوٰۃ کی شرط (۴۲) پوری ہو چکی تھی' تو اس کی زکوٰۃ وصول کرنے والے کے ذمہ نہیں' بلکہ ہبہ کرنے والے یا بیچنے والے کے ذمہ ہے۔ اگر اس سے پہلے ملکیت حاصل ہو گئی تو خریدار یا وصول کرنے والا زکوٰۃ دے گا۔

۱۰) جس پر اتنا قرض ہو کہ ادا کرنا چاہے تو پورا مال خرچ ہو جائے' یا باقی مال نصاب سے کم رہ جائے' تو ایسے شخص پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

---

۳۹) ایک خاص قسم کا جو' جس پر چھلکا نہیں ہوتا' بلکہ گندم سے مشابہ ہوتا ہے۔ حجاز وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

۴۰) مثلاً اگر پندرہ من چنے اور پانچ من مسور ہے تو بیس من غلہ کی زکوٰۃ کے طور پر ایک من چنے دے دیے جائیں۔

۴۱) عرب کی ایک پیداوار جس کا دانہ چھوٹا اور ملائم ہوتا ہے۔

۴۲) یعنی رنگ تبدیل ہونا' یا قابل استعمال ہونا' وغیرہ۔

تفہیم دین

مُحرَّمات (۲)

(حرام اُمور' جن سے بچنا ضروری ہے)

حافظ محمد زبیر

(۲) حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دینا

کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کا اختیار صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے پاس ہے۔ حلال وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال قرار دیا ہو اور حرام وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسولؐ حرام کہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ١١٦﴾ (النحل)

''اور تم مت کہو اس کے لیے جو کہ تمہاری زبانیں جھوٹ کہتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ تم اللہ پر جھوٹ باندھو۔ بے شک جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہ پائیں گے۔''

اس آیت کے حکم میں تین چیزیں شامل ہیں:

☆ کفار کی طرف سے کسی چیز کو ممنوع قرار دینا یا جائز قرار دینا' جیسا کہ آج کل کی کافر ریاستوں کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ چیز بین الاقوامی طور پر ممنوع ہے' یا فلاں چیز بین الاقوامی قانون سے متصادم ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے' یا فلاں چیز جنیوا معاہدات کی رو سے غلط ہے۔ کسی چیز کو جائز یا ممنوع قرار دینے کا اصل اختیار اللہ کے پاس ہے نہ کہ امریکہ اور دوسری طاقتوں کے پاس۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾ (الاعراف:٥٤)

''خبردار! اللہ ہی کے لیے پیدائش ہے اور حکم کا اختیار بھی اسی کے پاس ہے''۔

یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو پیدا کیا' وہی اکیلا خالق ہے اور باقی سب مخلوقات ہیں' لہٰذا حکم دینے کا اختیار بھی صرف اُسی کے پاس ہے' صرف وہی حاکم ہے باقی سب محکوم علیہ ہیں۔

☆ مسلمان یا غیر مسلم ریاستوں کا قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی کرنا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ قرآن مجید میں اس قانون سازی کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ﴾ (الشوریٰ:٢١)

''کیا ان کے لیے ایسے شریک ہیں جنہوں نے ان کے لیے ایسا دین (قانون) مقرر کیا ہو جس کا اللہ نے ان کو حکم نہ دیا ہو؟''

دنیا کی کسی بھی پارلیمنٹ یا اسمبلی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی کرے اور قرآن وسنت میں حرام کردہ چیزوں کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے۔

☆ علماء' صوفیاء' پیروں' مذہبی اور سیاسی لیڈروں کا کسی چیز کو حرام یا حلال ٹھہرانا بھی اس آیت میں داخل ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:٣١)

''انہوں نے (یہود ونصاریٰ نے) اپنے علماء اور صوفیاء کو اللہ کے علاوہ ربّ بنالیا تھا''۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیۂ مبارکہ کی تلاوت کرتے سنا تو فرمانے لگے کہ اے اللہ کے رسول! انہوں نے یعنی یہود ونصاریٰ نے تو اپنے علماء اور پیروں کو اپنا ربّ نہیں بنایا تھا' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَجَلْ وَلٰـكِنْ يُحِلُّوْنَ لَهُمْ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيَسْتَحِلُّوْنَهٗ وَيُحَرِّمُوْنَ عَلَيْهِمْ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ فَيُحَرِّمُوْنَهٗ فَتِلْكَ عِبَادَتُهُمْ لَهُمْ))[1]

''جی ہاں! لیکن وہ (علماء اور پیر) ان (یہود ونصاریٰ) کے لیے اس چیز کو حلال قرار دیتے جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا تھا تو وہ (یہود ونصاریٰ) بھی اس کو حلال سمجھنے لگتے' اور وہ (علماء اور پیر) ان کے لیے حرام ٹھہراتے اس چیز کو جس کو اللہ نے حلال قرار دیا تھا تو وہ (عوام الناس) بھی اس کو حرام سمجھنے لگتے' پس یہی تو اُن کی عبادت ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ ''یہی تو اُن کی عبادت ہے'' اس بات کو واضح کرتا ہے کہ حلت و حرمت کا اصل اختیار اللہ کی ذات کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ پر الزام عائد کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ﴾(التوبۃ:۲۹)

''نہیں وہ حرام ٹھہراتے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام ٹھہرایا ہو اور دینِ حق کو بطورِ دین اختیار نہیں کرتے''۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَی اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾ (یونس)

''(اے نبیؐ ان سے) کہہ دیں بھلا تم نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو رزق نازل کیا ہے اس میں سے بعض کو تم نے حلال اور بعض کو حرام بنالیا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کا حکم دیا تھا یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو؟''

۳) جادو

جادو کفر ہے اور سات بڑے کبیرہ گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔ جادو میں شر ہی شر ہے' اس میں خیر کا کوئی پہلو نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۰۲)

''اور وہ سیکھتے ہیں اس چیز کو جو اُن کے لیے نقصان دہ ہے اور ان کو نفع نہیں دیتی''۔

ایک جگہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی ﴿۶۹﴾﴾ (طٰہٰ)

''اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتا چاہے کہیں سے بھی آئے۔''

جادو کفر ہے' اور جادوگر کے بارے میں قتل کا حکم ہے اور اس کی کمائی حرام کی کمائی ہے۔ حضرت جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبَةٌ بِالسَّیْفِ))(۲)

''جادوگر کی حدّ یہ ہے کہ اس کی گردن تلوار سے اڑا دی جائے''۔

امام ترمذی اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

والعمل علی ھذا عند بعض اھل العلم من اصحاب النبی ﷺ وغیرھم وھو قول مالک بن انس وقال الشافعی انما یقتل الساحر اذا کان یعمل فی سحرہ ما یبلغ بہ الکفر فاذا عمل عملا دون الکفر فلم نر علیہ قتلا (۳)

''اللہ کے رسول ﷺ کے بعض اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہم کا اس حدیث پر عمل ہے۔ امام مالک کا قول بھی یہی ہے۔ امام شافعی کے نزدیک اگر جادوگر کا جادو ایسا ہو جو کہ کفر تک پہنچا دے تو ایسی صورت میں اس کو قتل کیا جائے گا اور جب اس کا کام ایسا ہو جو کہ کفریہ اعمال میں شمار نہ ہوتا ہو تو ہماری رائے ایسی صورت میں اس کے بارے میں قتل کی نہیں ہے''۔

حضرت بجالہ بن عبدۃ سے روایت ہے کہ میں احنف بن قیس کے چچا جزء بن معاویہ کا کاتب تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (اپنے دَورِ خلافت میں) اپنی وفات سے ایک سال پہلے ہماری طرف ایک فرمان جاری کیا کہ:

اُقْتُلُوْا کُلَّ سَاحِرٍ وَفَرِّقُوْا بَیْنَ کُلِّ ذِیْ مَحْرَمٍ مِنَ الْمَجُوْسِ وَانْھَوْھُمْ عَنِ الزَّمْزَمَۃِ فَقَتَلْنَا فِیْ یَوْمٍ ثَلَاثَۃَ سَوَاحِرَ (٤)

''ہر جادوگر کو قتل کر دو اور مجوس میں سے جس نے بھی اپنی محرم عورتوں سے شادی کر رکھی ہو اُن میں تفریق کر دو اور انہیں زمزمہ (ایسا کلام جو وہ کھانے کے وقت پست آواز سے کہتے تھے) سے منع کرو۔ چنانچہ ہم نے ایک دن میں تین جادوگروں کو قتل کیا۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جادو کو کفر قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰـکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَۗ وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَۃٌ فَلَا تَکْفُرْ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۰۲)

''اور حضرت سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا جو لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے اور (وہ پیچھے پڑے تھے اس چیز کے) جو نازل کیا گیا بابل شہر میں ہاروت اور ماروت پر! اور وہ دونوں کسی کو بھی جادو نہ سکھاتے تھے' یہاں تک کہ اس سے کہتے کہ ہم آزمائش ہیں پس تم (جادو سیکھ کر) کفر نہ کرو''۔

ہمارے معاشرے میں جادو ٹونہ' تعویذ گنڈا وغیرہ بہت پھیل چکا ہے۔ شہروں اور

دیہاتوں میں جگہ جگہ عاملین بیٹھے ہیں جو مختلف شیاطین کو قابو کرنے کے لیے چلّے کاٹتے ہیں اوران کی سفلی خواہشات کو پورا کرتے ہیں۔ بعد میں یہی عاملین جاہل عوام الناس سے پیسے بٹورنے کے لیے جادوٹونہ کرتے ہیں۔ عام طور پرعورتوں میں جادوٹونے کا معاملہ زیادہ ہوتا ہے۔ جادوٹونے کی اصل بنیاد حسد' بغض اور کینہ ہے' جس کی وجہ سے ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کے گھر' خاندان' کاروباراورتجارت وغیرہ کو تباہ کرنے کے لیے جادوگروں کی طرف رجوع کرتا ہےاور جادوگراُس سے اِس کام کے لیےاچھی خاصی رقم وصول کرتا ہے۔ جادو کروانے والا بھی جادو کے گناہ میں اتنا ہی شریک ہوتا ہے جتنا کہ جادوگر۔ اب اِن سوالات کےحل کے لیے کہ جادوگرکس طرح جادو کرتے ہیں' جادو کی کیا علامات ونشانیاں ہیں' جادواگرکسی پر ہوجائے تو قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا کیاعلاج ہے؟''جادوگروں کا قلع قمع کرنے والی تلوار'' نامی کتاب کا مطالعہ قارئین کے لیےمفید ہوگا۔فتنوں کے اِس دَور میں یہ کتاب ہر گھر میں ہونی چاہیے۔

۴) کہانت اورنجوم پرستی

کاہن اورنجومی علمِ غیب کا دعویٰ کرتے ہیں' حالانکہ اللہ کےسوا کوئی علمِ غیب کو جاننے والانہیں ہے۔ اب تو اخبارات میں علمِ نجوم کی روشنی میں باقاعدہ کالم شائع ہوتے ہیں جن میں یہ بتایا جاتا ہےکہ''آپ کا یہ ہفتہ کیسارہے گا''۔لوگ اپنے سفر' تجارت' کاروبار' تعلیم اور شادی وغیرہ کےروزمرہ کےمعاملات میں کاہنوں اورنجومیوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ بعض اوقات ان کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر' بعض اوقات زمین پرلکیریں کھینچ کراور بعض اوقات ستاروں کی نقل وحرکت سے اندازے لگا کرلوگوں کواُن کے مستقبل کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان کاہنوں اورنجومیوں کے یہ تمام اعمال جھوٹ اور بکواس ہیں۔ جوکچھ مستقبل کے بارے میں وہ پیشین گوئیاں کرتے ہیں ان میں اگردس سچی ہوتی ہیں تو نوے جھوٹی ہوتی ہیں۔ایسے کاہنوں اورنجومیوں کے پاس جانے اوران کی تصدیق کرنے کواللہ کےرسولﷺ نے کفر میں شمار کیا ہے۔آپؐ کاارشاد ہے:

((مَنْ اَتٰی کَاھِنًا اَوْ عَرَّافًا فَصَدَّقَهٗ بِمَا یَقُوْلُ فَقَدْ کَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ﷺ)) (۵)

''جوکوئی بھی کسی کاہن یا نجومی کے پاس آیا اوراس نے اس کےقول کی تصدیق کی تو

اس شخص نے اس چیز کا انکار کیا جو محمد ﷺ پر نازل کی گئی۔''

اسی طرح آپ ﷺ کی ایک اور حدیث ہے:

((مَنْ اَتٰی عَرَّافًا فَسَأَلَهٗ عَنْ شَیْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهٗ صَلَاةٌ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً))[٦]

''جو کوئی کسی نجومی کے پاس آیا اور اس نے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہ ہوگی''۔

حضرت خالد بن زید الجہنی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ والے دن ہمیں صبح کی نماز پڑھائی' جبکہ رات کو بارش ہوئی تھی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((هَلْ تَدْرُوْنَ مَا ذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟)) قَالُوا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ' قَالَ: ((اَصْبَحَ مِنْ عِبَادِیْ مُؤْمِنٌ بِیْ وَكَافِرٌ' فَاَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهٖ فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِیْ وَكَافِرٌ بِالْكَوْكَبِ' وَاَمَّا مَنْ قَالَ بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِیْ وَمُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ))[٧]

''کیا تم جانتے ہو تمہارے ربّ نے کیا کہا ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''آج میرے بعض بندوں نے اس حال میں صبح کی کہ وہ میرے اوپر ایمان لانے والے تھے اور کچھ میرا انکار کرنے والے تھے۔ پس جنہوں نے کہا کہ ہمارے اوپر اللہ کے فضل اور رحمت سے بارش ہوئی تو یہ لوگ ہیں جو مجھ پر ایمان لانے والے ہیں اور ستاروں کا انکار کرنے والے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ یہ بارش فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے ہوئی ہے تو ایسے لوگ میرا انکار کرنے والے ہیں اور ستاروں پر ایمان لانے والے ہیں''۔

اس حدیث میں ان لوگوں کو کافر کہا گیا ہے جو کہ زمانے کے حادثات و واقعات کو ستاروں کی نقل و حرکت سے متعلق کرتے ہیں اور تدبیر الٰہی کو اصل وجہ و علت قرار نہیں دیتے۔

۵) اَوہام پرستی

کسی چیز کو منحوس سمجھنا اَوہام پرستی ہے۔ مثلاً اکثر لوگ محرم یا صفر کے مہینے میں نکاح کو نحوست کا باعث سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بعض مخصوص اعداد مثلاً ۱۳ کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اگر

کہیں جاتے وقت کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو اس کو برا سمجھا جاتا ہے۔ صبح سویرے کسی خاص آدمی سے ملاقات کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ عام طور پر لوگوں کی زبانوں پر یہ کلمہ جاری ہوتا ہے کہ صبح صبح فلاں کا چہرہ دیکھ لیا اب پتا نہیں سارا دن کیسا گزرے گا؟ یہ سب اَوہام پرستی میں داخل ہے۔ اہل عرب جب کسی سفر پر جاتے تو تیر کے ذریعے یا پرندے کو اُڑا کر فال نکالتے تھے' اگر پرندہ دائیں طرف جاتا تو اس کام کے لیے سفر کو اپنے لیے اچھا سمجھتے تھے اور اگر پرندہ بائیں طرف جاتا تو اسے اپنے حق میں برا سمجھتے تھے۔ ہمارے ہاں آج بھی دیہاتوں میں کوّے کی گھر میں آمد کو کسی مہمان کے آنے کی علامت سمجھا جاتا ہے' اور تیز آندھی یا طوفان کے بارے میں معروف ہے کہ یہ قتلِ ناحق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں حرام ہیں اور شرک میں داخل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلطِّیَرَةُ شِرْکٌ اَلطِّیَرَةُ شِرْکٌ ثَلَاثًا ـــ وَمَا مِنَّا اِلاَّ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُذْھِبُہُ بِالتَّوَکُّلِ))[۸]

''بری فال لینا شرک ہے' بری فال لینا شرک ہے ـــ آپؐ نے تین مرتبہ یہ بات کہی ـــ اور وہ شخص ہم میں سے نہیں جو فال لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کے توکّل کو لے جاتا ہے''۔

۶) غیر اللہ کی قسم کھانا

اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے جس کی چاہے قسم کھاتا ہے' لیکن مخلوق کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی قسم کھائے۔ مثلاً کعبہ کی قسم کھانا' کسی نبی' ولی' پیر' فقیر یا محبوب کے سر کی قسم کھانا ممنوع اور ناجائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ حَلَفَ بِغَیْرِ اللّٰہِ فَقَدْ کَفَرَ اَوْ اَشْرَکَ))[۹]

''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا یا کفر کیا''۔

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ حَلَفَ فَقَالَ فِیْ حَلْفِہٖ وَاللَّاتِ وَالْعُزّٰی فَلْیَقُلْ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ))[۱۰]

''جس نے کوئی قسم کھائی اور اپنی قسم میں لات اور عزیٰ کا نام لیا تو اسے چاہیے کہ وہ کلمہ لا الٰہ الاّ اللہ پڑھ لے'' (یعنی اپنے ایمان کی تجدید کرے)۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ ایک قافلے میں

شریک تھے اور آپؓ نے اپنے باپ کی قسم کھائی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلَا اِنَّ اللّٰہَ یَنْھَاکُمْ اَنْ تَحْلِفُوْا بِآبَآئِکُمْ ' فَمَنْ کَانَ حَالِفًا فَلْیَحْلِفْ بِاللّٰہِ وَاِلَّا فَلْیَصْمُتْ))[11]

''خبردار! اللہ تم لوگوں کو اپنے باپ دادا کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے۔ پس جس نے تم میں سے قسم کھانی ہو تو وہ اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔''

۷) منافقین اور فُسّاق کے ساتھ دل بہلانے کے لیے بیٹھنا

منافقین اور فاسقین کی مجالس میں بیٹھنا اور ان کے ساتھ خوش گپیاں کرنا ایمان میں کمی کا باعث بنتا ہے' کیونکہ ایسے لوگوں کی مجالس میں اکثر و بیشتر اللہ کے دین اور شریعت اسلامیہ کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ ط وَاِمَّا یُنْسِیَنَّکَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ﴿۶۸﴾﴾ (الانعام)

''اور جب آپ دیکھیں ان لوگوں کو جو کہ اللہ کی آیات کے بارے میں کج بحثی کرتے ہیں تو آپ ایسے لوگوں سے اعراض کریں' یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔ اور اگر شیطان آپ کو بھلا دے (اور آپ اُن کے شریکِ مجلس ہو جائیں) تو یاد آنے کے بعد ظالم قوم کے ساتھ مت بیٹھیں''۔

ایک اور جگہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَیُسْتَھْزَاُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖٓ ز اِنَّکُمْ اِذًا مِّثْلُھُمْ ط﴾ (النساء: ۱۴۰)

''اور تم پر کتاب میں یہ بات نازل ہو چکی ہے کہ جب تم اللہ کی آیات کے بارے میں سنو کہ اُن کا انکار کیا جاتا ہے اور اُن کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو (جو آیاتِ الٰہی کا انکار کرتے اور مذاق اڑاتے ہیں)' یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔ (اگر تم ان کے ساتھ بیٹھے رہے) تو تم بھی یقیناً ان کے مانند ہو جاؤ گے''۔

لہٰذا شادی بیاہ، خوشی اور غمی کی ایسی تمام مجالس میں جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہوتی ہو شرکت کرنا حرام ہے، چاہے کوئی کتنا ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ ہاں اگر دعوت وتبلیغ کی نیت ہو تو ایسی محفلوں میں شرکت کی جاسکتی ہے۔

۸) نماز کو چھوڑ دینا

نماز کو چھوڑنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے چاہے ایک نماز ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ نماز کو چھوڑنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو وقت پر ادا نہ کرنا۔ اگر کوئی شخص عمداً، یعنی کسی عذر کے بغیر، نماز کو اُس کے وقت کے بعد ادا کرتا ہے تو یہ بھی ''تارک الصلاۃ'' کے حکم میں آئے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اہل جنت، جنت میں داخل ہونے کے بعد جہنمیوں سے سوال کریں گے کہ:

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿٤٢﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿٤٣﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿٤٤﴾ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٤٦﴾ حَتّٰى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿٤٧﴾﴾ (المدّثر)

''(اہل جنت مجرموں سے پوچھیں گے کہ) کس چیز نے تم کو جہنم میں ڈالا؟ تو وہ کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، اور دین میں کج بحثی کرنے والوں کے ساتھ ہم بھی کج بحثی میں مشغول رہتے تھے، اور آخرت کے دن کو جھٹلاتے تھے، یہاں تک کہ موت نے ہمیں آلیا۔''

یہ آیت بتلا رہی ہے کہ اہل جہنم اپنے جہنم میں جانے کے جو اسباب اہل جنت کو گنوائیں گے ان میں سب سے پہلی چیز نماز کو چھوڑنا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ (المنٰفقون)

''اے ایمان والو! تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دے۔ اور جو کوئی ایسا کرے گا تو وہی لوگ خسارے والے ہیں۔''

اکثر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں پر ''ذکر'' سے مراد نماز ہے۔ یعنی تمہارے مال اور اولاد تمہیں نماز سے غافل نہ کر دیں۔ قرآن مجید میں ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم نے ان میں انبیاء بھیجے، لیکن ان انبیاء کے جانشین ناخلف قسم کے لوگ تھے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا۔

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ﴿٦٠﴾﴾ (مریم)

''پھر اُن کے بعد کچھ ناخلف قسم کے جانشین آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور اپنی خواہشات کی پیروی کی' پس یہ لوگ عنقریب گمراہی کو دیکھ لیں گے۔ سوائے اُن کے جنہوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور نیک عمل کیے' تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن کے ساتھ ذرا برابر زیادتی بھی روا نہیں رکھی جائے گی''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ انہوں نے کلی طور پر نماز کو ترک نہیں کیا تھا' بلکہ نمازوں کو ان کے اوقات سے مؤخر کر کے پڑھا کرتے تھے۔

ایک جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ان لوگوں کی بات ہو رہی ہے جو ظہر کی نماز عصر کے وقت' عصر کی مغرب کے وقت' مغرب کی عشاء کے وقت' عشاء کی فجر کے وقت اور فجر کی سورج طلوع ہونے کے وقت پڑھتے ہیں۔ جو آدمی اس حال میں مر گیا اور اس نے توبہ نہ کی تو اللہ تعالیٰ اس کو ''غیّ'' میں داخل کرے گا جو کہ جہنم کی ایک وادی کا نام ہے جو انتہائی گہری ہے اور اس کا کھانا ناپاک چیزیں ہیں۔

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ﴿٤﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴿٥﴾﴾ (الماعون)

''بربادی ہے ان نمازیوں کے لیے' جو اپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں۔''

اس آیۂ مبارکہ میں ان نمازیوں کی بات ہو رہی ہے جو نماز کو پڑھتے ہیں لیکن اس میں سستی کرتے ہیں' وقت سے مؤخر کر کے پڑھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ہلاکت اور تباہی ہے۔ اور جو شخص نماز بالکل پڑھتا ہی نہیں اس کا کیا انجام ہوگا' ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ رسول اللہ ﷺ نے جان بوجھ کر بغیر کسی عذر کے نماز چھوڑنے کو کفر قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكَ الصَّلَاةِ))[1]

''یقیناً آدمی اور شرک و کفر کے درمیان فرق صرف نماز چھوڑنے کا ہے''۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ حَافَظَ عَلَيْهَا كَانَتْ لَهُ نُوْرًا وَبُرْهَانًا وَنَجَاةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ' وَمَنْ لَمْ

يُحَافِظْ عَلَيْهَا لَمْ تَكُنْ لَّهُ نُوْرًا وَلَا بُرْهَانًا وَلَا نَجَاةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَكَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ فِرْعَوْنَ وَقَارُوْنَ وَهَامَانَ وَاُبَيِّ بْنِ خَلَفٍ)) (١٣)

''جس نے نماز کی حفاظت کی تو نماز قیامت کے دن اس کے لیے نور' دلیل اور نجات کا ذریعہ ہو گی اور جس نے نماز کی حفاظت نہ کی تو نماز قیامت کے دن اس کے لیے نور' دلیل اور نجات کا باعث نہ ہو گی۔ اور قیامت کے دن بے نمازی کا حشر فرعون' قارون' ہامان اور اُبی بن خلف کے ساتھ ہو گا''۔

علماء نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ نماز چھوڑنے کے اسباب میں عام طور پر مال' حکومت' وزارت اور تجارت شامل ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنے مال کی وجہ سے نماز چھوڑی تو اس کا حشر قارون کے ساتھ ہو گا' اور اگر اس نے اپنے عہدے یا حکومت کی وجہ سے نماز چھوڑی تو اس کا حشر فرعون کے ساتھ ہو گا' اور اگر اس نے اپنی وزارت کی وجہ سے نماز ترک کی تو اس کا حشر ہامان کے ساتھ ہو گا اور اگر اس نے اپنی تجارت کی وجہ سے نماز ترک کی تو اس کا حشر اُبی بن خلف کے ساتھ ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک اور حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا:

((اِنَّ اَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عَمَلِهٖ صَلَاتُهٗ فَاِنْ صَلُحَتْ فَقَدْ اَفْلَحَ وَاَنْجَحَ وَاِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ)) (١٤)

''یقیناً قیامت کے دن بندے کے اعمال میں سے سب سے پہلی چیز جس کا حساب لیا جائے گا' وہ اس کی نماز ہے' اگر نماز صحیح نکلی تو وہ کامیاب و کامران ہو جائے گا اور اگر نماز فاسد ہوئی تو ناکام و نامراد ہو گا''۔

ائمہ اربعہ کا تارک الصلوٰۃ کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ' ابراہیم النخعیؒ' عبداللہ بن مبارکؒ اور اسحٰقؒ کا موقف ہے کہ نماز کو جان بوجھ کر چھوڑنے والا کافر ہے اور ایسا شخص اگر توبہ کر کے نماز پڑھنے نہ لگ جائے تو اس کو قتل کیا جائے گا' کیونکہ وہ مرتد ہے اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ نماز کو عمداً ترک کرنے والا اگرچہ کافر نہیں ہے' لیکن اس پر نماز چھوڑنے کی حدّ جاری کی جائے گی اور وہ حدّ اس کی گردن کو تلوار سے اڑانا ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ نماز کو بغیر کسی عذر کے چھوڑنے والے کو جیل میں قید کر دیا جائے اور جب تک توبہ کر کے نماز نہ پڑھنے لگے اس کو رہا نہ کیا جائے۔

ائمہ اربعہ کے حوالے سے یہ فتاویٰ بیان کرنے کا مقصد بالکل بھی یہ نہیں ہے کہ نماز میں

کوتاہی کرنے والوں کو کافر کہا جائے' بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں پر واضح کیا جائے کہ نماز کو دین میں کس قدر اہمیت حاصل ہے اور اس کا ترک کرنا کتنا بڑا گناہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مُرُوا الصَّبِیَّ بِالصَّلَاۃِ اِذَا بَلَغَ سَبْعَ سِنِیْنَ' وَاِذَا بَلَغَ عَشْرَ سِنِیْنَ فَاضْرِبُوْہُ عَلَیْھَا))(۱۵)

''بچے کو نماز کا حکم دو جبکہ وہ سات سال کی عمر کو پہنچ جائے' اور جب وہ دس سال کا ہو جائے تو تو نماز نہ پڑھنے پر اُس سے سختی کا معاملہ کرو''۔

ایک اور روایت میں الفاظ ہیں:

((مُرُوْا اَوْلَادَکُمْ بِالصَّلَاۃِ وَھُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِیْنَ' وَاضْرِبُوْھُمْ عَلَیْھَا وَھُمْ اَبْنَاءُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوْا بَیْنَھُمْ فِی الْمَضَاجِعِ))(۱٦)

''اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جبکہ وہ سات سال کے ہو جائیں' اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر اُن کو مارو اور (دس سال کی عمر میں) ان کے بستر علیحدہ کر دو''۔

مارنے سے مراد سختی کی کوئی بھی ایسی صورت ہو سکتی ہے جس سے بچے نماز پڑھنے لگ جائیں۔ بستر علیحدہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بچوں کے بستر آپس میں جدا کر دو۔ دس سال کی عمر کے بعد اُن کو ایک ہی بستر پر مت سلاؤ۔

۹) نماز کو اطمینان سے ادا نہ کرنا

نماز کی چوری کو رسول اللہ ﷺ نے بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے۔ آپ ؐ کا ارشاد ہے:

((اَسْوَءُ النَّاسِ سَرَقَۃً الَّذِیْ یَسْرِقُ مِنْ صَلَا تِہٖ)) قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَیْفَ یَسْرِقُ مِنْ صَلَا تِہٖ؟ قَالَ: ((لَا یَتِمُّ رُکُوْعَھَا وَلَا سُجُوْدَھَا))(۱۷)

''بدترین چور وہ ہے جو نماز میں چوری کرے''۔ صحابہ ؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! نماز میں چوری سے کیا مراد ہے؟ آپ ؐ نے فرمایا: ''نماز پڑھتے وقت رکوع اور سجود کو اچھی طرح ادا نہ کرنا''۔

نماز کو جلدی جلدی ادا کرنا' رکوع و سجود کو اطمینان سے ادا نہ کرنا' رکوع سے اٹھتے وقت سیدھا کھڑے ہوئے بغیر سجدے میں چلے جانا اور دونوں سجدوں کے درمیان اطمینان سے نہ

بیٹھنا، سجدوں کو ایسے ادا کرنا جیسا کہ کوئی کوّا ٹھونگیں مارتا ہے، یہ سب نماز کی چوری میں داخل ہے۔ اطمینان کے ساتھ نماز ادا کرنا نماز کا ایک رکن ہے۔ اس کے بغیر نماز صحیح ادا نہیں ہوتی۔

حضرت ابوعبداللہ الاشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو نماز پڑھائی، پھر آپؐ ان میں سے کچھ لوگوں کے پاس بیٹھ گئے، اتنے میں ایک آدمی آیا اور اس نے نماز پڑھنا شروع کی۔ وہ جلدی جلدی رکوع کر رہا تھا اور کوّے کی طرح ٹھونگیں مارتے ہوئے سجدہ کر رہا تھا تو آپؐ نے فرمایا:

((مَنْ مَّاتَ عَلٰی هٰذَا مَاتَ عَلٰی غَیْرِ مِلَّةِ مُحَمَّدٍ یَنْقُرُّ صَلَاتَهٗ کَمَا یَنْقُرُّ الْغُرَابُ الدَّمَ، اِنَّمَا مَثَلُ الَّذِیْ یَرْکَعُ وَیَنْقُرُّ فِیْ سُجُوْدِهٖ کَالْجَائِعِ لَا یَاْکُلُ اِلَّا التَّمْرَةَ اَوِ التَّمْرَتَیْنِ فَمَاذَا تُغْنِیَانِ عَنْهُ!))[۱۸]

''جو شخص اس طریقے پر نماز پڑھتے ہوئے مر گیا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر نہیں مرا، وہ اپنی نماز کو ایسے کریدتا ہے جیسے کوّا خون کو کریدتا ہے۔ ایسے شخص کی مثال جو رکوع (میں جلدی) کرتا ہے اور سجدے میں ٹھونگیں مارتا ہے اس بھوکے آدمی کی طرح ہے جو بس ایک یا دو کھجوریں کھاتا ہے۔ تو یہ ایک دو کھجوریں اس کی بھوک میں کیسے کفایت کریں گی؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی نماز کو منافق کی نماز قرار دیا ہے۔ آپؐ کا فرمان ہے:

((تِلْکَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ یَجْلِسُ یَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰی اِذَا کَانَتْ بَیْنَ قَرْنَیِ الشَّیْطَانِ قَامَ فَنَقَرَهَا اَرْبَعًا لَا یَذْکُرُ اللّٰهَ فِیْهَا اِلَّا قَلِیْلًا))[۱۹]

''یہ منافق کی نماز ہے جو سورج کے غروب ہونے کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہوتا ہے (یعنی غروب ہونے لگتا ہے) تو کھڑا ہوتا ہے اور کوے کی طرح چار ٹھونگیں لگاتا ہے اور اپنی اس نماز میں اللہ کا ذکر نہیں کرتا مگر تھوڑا۔''

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بوجھ کر عصر کی نماز لیٹ پڑھنے والوں کو منافق قرار دیا ہے۔ نماز کی ادائیگی کے لیے مستحب و افضل عمل یہی ہے کہ اس کو اوّل وقت میں ادا کیا جائے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے دیکھا جو نماز میں رکوع اور سجدے کو ٹھیک طرح سے ادا نہیں کر رہا تھا تو آپؓ نے اس سے کہا:

مَا صَلَّیْتَ وَلَوْ مُتَّ مُتَّ عَلٰی غَیْرِ الْفِطْرَةِ الَّتِیْ فَطَرَ اللّٰهُ مُحَمَّدًا صلی اللہ علیہ وسلم[۲۰]

''تو نے نماز دراصل نہیں پڑھی، اوراگر ایسے ہی نماز پڑھتے پڑھتے تُو مرگیا تو حضرت محمد (ﷺ) کے دین پرنہیں مرے گا''۔

حواشی

١) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب من سورة التوبة۔ ورواه البیهقی ایضاً واللفظ له۔
٢) سنن الترمذی، کتاب الحدود عن رسول الله ﷺ، باب ما جاء فی حد الساحر۔
٣) ایضاً۔
٤) سنن ابی داوٗد، کتاب الخراج والامارة والفیئ، باب فی اخذ الجزیة من المجوس۔
٥) مسند احمد، جلد٣، ص ١٦٤، دار احیاء التراث العربی۔
٦) صحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحریم الکهانة واتیان الکهان۔
٧) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب یستقبل الامام الناس اذ اسلّم۔
٨) سنن ابی داوٗد، کتاب الطب، باب فی الطیرة۔
٩) سنن الترمذی، کتاب النذور والایمان عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء فی کراهیة الحلف بغیر الله۔
١٠) صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب افرأیتم اللات والعزی۔
١١) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب من لم یر اکفار من قال ذلك متأولا او جاهلا۔
١٢) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترك الصلاة۔
١٣) صحیح ابن حبان، کتاب الصلاة، باب ذکر الزجر عن ترك المرء المحافظة علی الصلوات والمفروضات۔
١٤) سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ما جاء ان اوّل ما یحاسب به العبد یوم القیامة الصلاة۔
١٥) سنن ابی داوٗد، کتاب الصلاة، باب متی یؤمر الغلام بالصلاة۔
١٦) سنن ابی داوٗد، کتاب الصلاة، باب متی یؤمر الغلام بالصلاة۔
١٧) صحیح ابن خزیمة، کتاب الصلاة، باب النهی عن نقرة الغراب فی السجود۔
١٨) صحیح ابن خزیمة، کتاب الصلاة، باب النهی عن نقرة الغراب فی السجود۔
١٩) صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب استحباب التبکیر بالعصر۔
٢٠) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب اذا لم یتم الرکوع۔

مولانا ابوالکلام آزاد

عبدالرشید عراقی

مولانا ابوالکلام آزاد جیسی نابغہ روزگار شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں' جو افکار و تصورات کی دنیا میں قوموں اور ملتوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیتی ہیں اور تاریخ کا نیا دَور شروع کرتی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد میں فطری عظمت تھی۔ وہ مجتہدانہ دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے' اور اپنے کمالات کے اعتبار سے ایک عظیم عالم دین تھے' مفکر تھے' مجتہد تھے' مفسر قرآن تھے' محدث تھے' مؤرخ تھے' محقق تھے' معلم تھے' متکلم تھے' ادیب' نقاد اور دانشور تھے' شعلہ بیان خطیب تھے' بلند پایہ صحافی اور مصنف تھے۔ ذہانت' ذکاوت' تدبر' بصیرت' فراست' فہم اور فکر میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ فطرتاً عبقری تھے۔ مولانا ظفر علی خان نے ان کے بارے میں فرمایا تھا: ؎

جہانِ اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہو گئی
ہے تجھ کو اس میں جستجو تو پوچھ ابوالکلام سے

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت دین' سیاست' وطنیت اور جدت وقدامت میں نہایت دلکش امتزاج کی حامل تھی۔ ان کی نظر بڑی حکیمانہ تھی۔ ایک طرف وہ بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور اپنی تہذیبی روایات کے امین ومحافظ تھے تو دوسری طرف ایک بہت بڑے سیاست دان بھی تھے' اور ان کا شمار اُس عہد کے نامور مدبرین ومفکرین میں ہوتا تھا۔ انہوں نے برصغیر کی سیاست میں گہرے نقوش چھوڑے۔

مولانا ابوالکلام نظم ونثر اور خطابت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کی نثر کی برصغیر پاک وہند میں مثال نہیں ملتی۔ مولانا حسرت موہانی آپ کی نثر کے بارے میں فرماتے ہیں:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

خطابت میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کی خطابت کا پورے برصغیر میں شہرہ تھا۔ مولانا حسرت فرماتے ہیں:

سب ہو گئے ہیں خاموش حسرتؔ
گویا ہیں ابوالکلام آزاد

آپ نے خطابت کو ایک نیا رنگ دیا اور اس میں مقبولیت پیدا کی۔ بقول شورش کاشمیری:

''ابوالکلام' ابوالکلام نہ ہوتے تو تاج محل ہوتے' اگر تاج محل انسانی پیکر میں ڈھل جائے تو وہ ہرگز ہرگز ابوالکلام نہیں ہوسکتا۔''

صحافت میں بھی مولانا ابوالکلام آزاد کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ آپ ایک عظیم صحافی تھے۔ آپ کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۸۹۸ء میں ہوا' اور ۱۹۲۷ء کو اختتام پذیر ہوا۔ آپ کئی رسائل و اخبارات کے مدیر و معاون مدیر رہے۔ آپ نے خود کئی ایک رسائل جاری کیے جن کی تفصیل یہ ہے: ماہنامہ نیرنگ عالم' ہفت روزہ المصباح' ماہنامہ لسان الصدق' ہفت روزہ الہلال اور ہفت روزہ البلاغ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو سب سے زیادہ شہرت ہفت روزہ الہلال کے ذریعے ملی۔ یہ اخبار آپ نے ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے جاری کیا۔ الہلال اردو صحافت میں ایک نیا باب تھا۔ الہلال صحیح معنوں میں برصغیر کی سیاسی' صحافتی اور ادبی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ الہلال عصری صحافت میں محض ایک اخبار کا اضافہ نہ تھا' بلکہ وہ اپنی ذات میں خود ایک مستقل تحریک تھا جس نے طوفانِ حوادث میں اسلامیانِ عالم اور برصغیر کے مسلمانوں کی ناخدائی کا فریضہ انجام دیا۔ الہلال محض ایک اخبار نہیں تھا' بلکہ ایک صورِ قیامت تھا جس نے مسلمانوں میں بیداری کی روح پھونکی اور جذبۂ آزادی جو سرد پڑ گیا تھا' اس کو بھڑکایا۔ مولانا ابوالکلام نے اس کے ذریعے کلمۂ حق بلند کیا اور جرأت و حق گوئی کی وہ مثال قائم کی جو برصغیر کی اردو صحافت میں ایک نئی چیز تھی۔

الہلال کی امتیازی خصوصیت اور اس کی مقبولیت مولانا ابوالکلام کی طرز تحریر اور علوم اسلامیہ پر اُن کی گہری نظر تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی شہرت و مقبولیت کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اس کے ادارۂ تحریر میں اُس وقت کی ممتاز علمی و ادبی شخصیتیں شامل تھیں' مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی' مولانا عبدالسلام ندوی' خواجہ عبدالواجد ندوی' علامہ عبداللہ عمادی' حامد علی صدیقی اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔ مالک رام اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

''الہلال کے تمام کارناموں سے قطع نظراس کی اہمیت اور معیار کا اندازہ لگانے کے لیے صرف اس کا حیرت انگیز ادارۂ تحریر ہی کافی ہے' جو ملک کے صفِ اوّل کے ادیبوں اور انشاء پردازوں پر مشتمل تھا۔ ہفتہ وار تو درکنار کسی اردو ماہنامے کو بھی آج تک ایسا شاندار ایڈیٹوریل سٹاف نہ ملا ہوگا۔''

بہر حال یہ حقیقت ہے' اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں اور اس کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ الہلال نے مسلمانانِ برصغیر کو قومی وملّی زندگی کا احساس دلایا' سیاسی شعور پیدا کیا اور شاہراہِ عمل کی طرف راہنمائی کی۔ ایثار وقربانی کا جذبہ پیدا کیا اور زندگی کے میدانوں میں سر گرمِ عمل کر دیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک بہت بڑے سیاستدان بھی تھے' اُن کا شمار برصغیر (پاک و ہند) کے اُن سیاستدانوں میں ہوتا تھا جو اپنے فکر و تدبر کے لحاظ سے اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ مولانا نے اپنے فہم وبصیرت کے مطابق ایک خاص جماعت کو اپنی سیاسی تگ وتاز کا محور بنایا۔ لیکن ان کی بصیرت کی کارفرمائیاں صرف کانگریس تک ہی محدود نہ تھیں' بلکہ مجلسِ خلافت' جمعیت العلماء اور مجلسِ احرار کے قیام میں بھی ان کی راہنمائی شامل تھی۔

مولانا آزاد نے جب برصغیر کے سیاسی میدان میں قدم رکھا تو اُس وقت برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کا خوف وہراس تھا۔ مولانا کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اس خوف وہراس کو مسلمانوں کے دلوں سے دور کیا' اور مسلمانوں کو سیاسی اشغال میں مصروف کر دیا' بلکہ سیاسی جدوجہد کو ان کے لیے بازیچۂ اطفال بنا دیا۔ خوف وہراس کو دور کر کے ان کے دلوں میں سکون واطمینان پیدا کیا اور ان کو انقلاب وتغیر سے آشنا کر دیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ آپ نے تمام علوم اسلامیہ پر بڑی عمدہ' علمی اور تحقیقی کتابیں لکھیں۔ مولانا کا عظیم شاہکار اور علمی کارنامہ ''ترجمان القرآن'' ہے۔ یہ قرآنِ مجید کی بڑی عمدہ تفسیر ہے جو صرف سورۂ نور تک لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں تذکرہ' کاروانِ خیال' غبارِ خاطر' قولِ فیصل' مسئلۂ خلافت اور جزیرۃ العرب' جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد' حقیقت الصلوٰۃ اور حقیقت الزکوٰۃ شاہکار کتابیں ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے علمی تبحر اور ان کی عظمت کا اعتراف ان کی زندگی میں بھی اور بعد وفات بھی برصغیر (پاک وہند) کے اکابر اہل علم' مفکرین اور سیاسی لیڈروں نے کیا

ہے۔مولانا محمد علی جوہر نے فرمایا تھا کہ:''میں ابوالکلام کو اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں اوران شاء اللہ ہمیشہ تسلیم کرتا رہوں گا۔''

علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ''تمام ہندوستان میں ایک عالم ہے جو کم و بیش مجتہدانہ حیثیت کا اہل ہوسکتا ہے،یعنی ابوالکلام آزاد۔'' علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا کہ ''اقبال، محمد علی اور ابوالکلام آزاد تھوڑے تھوڑے فرق سے ایک ہی منزل رجوع الی الاسلام کے منادی تھے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا تھا کہ''مولانا ابوالکلام آزاد کا دماغ کئی ہزار دماغوں کو نچوڑ کر بنایا گیا تھا۔''سجاد انصاری نے لکھا تھا کہ''میرے نزدیک اقبال اورمولانا ابوالکلام آزاد حقیقی معنوں میں فوق البشر ہیں۔'' شورش کاشمیری نے لکھا تھا کہ'' مولانا ابو الکلام آزاد شاہسوارِ علم تھے۔'' پروفیسر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی فرمایا کرتے تھے کہ''مولانا ابوالکلام فطرتاً عبقری تھے،علومِ اسلامیہ کا بحرِ زخار تھے اورامام الہند تھے۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں رحلت فرمائی۔**انا للّٰہ و انّا الیہ راجعون!**

1

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (29)

پاکستان (8)

تحقیق و تحریر: سید قاسم محمود

صوبوں میں کانگریس راج

مسلم لیگ کی عوامی تنظیم کا آغاز دراصل اسی انتخاب سے ہوا تھا۔ تنظیم اور سرمائے کی کمی کے باعث وہ ہر نشست سے اپنا امیدوار کھڑا نہیں کر سکتی تھی، خصوصاً مسلم اکثریت کے صوبوں میں صوبائی نوعیت کی مضبوط اور منظّم جماعتوں کے مقابلے میں اس کی حیثیت بہت کمزور تھی۔ اس کے باوجود ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمان نشستوں سے مسلم لیگ کے امیدوار بھاری تعداد میں کامیاب ہوئے۔ دستور کے مطابق وزارتوں میں اہم اقلیتوں کے نمائندوں کو شامل کرنا لازم تھا، لیکن اس سلسلے میں کانگریس نے مسلم لیگ کو یا تو قطعاً نظر انداز کر دیا یا اس قسم کی ناقابل قبول شرائط پیش کیں جن سے اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کا وجود ہی ختم ہو جاتا تھا، لہٰذا مسلم لیگ نے اکثر صوبائی مجالس میں حزب اختلاف کی نشستیں سنبھالیں۔ اسی زمانے میں جواہر لال نہرو نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں: کانگریس اور حکومت برطانیہ۔ یہ صرف مسلم لیگ ہی کے نہیں بلکہ مسلمانانِ ہند کے جداگانہ قومی وجود سے انکار تھا۔ لہٰذا (قائداعظم) مسٹر جناح نے جواب دیا کہ نہیں، تیسری پارٹی مسلمان ہیں اور مسلم لیگ ہے، اور کانگریس کو یو۔پی میں مسلمانوں کی پانچ نشستوں پر ہونے والے ضمنی انتخابات میں مقابلہ کرنے کا چیلنج دیا۔ انتخابات ہوئے تو کانگریس کی انتہائی کوششوں کے باوجود ہر نشست سے مسلم لیگی امیدوار کامیاب ہوا۔ اس کے بعد کانگریس نے مسلمانوں میں رابطۂ عوام (Mass Contact) کی مہم چلائی اور اس پر بڑی فراخ دلی سے روپیہ صرف ہوا، لیکن مسلمان عوام میں اسے کوئی مقبولیت حاصل نہ ہوئی اور اس کے بعد جہاں بھی ضمنی انتخابات ہوئے، مسلم لیگ کامیاب رہی۔

کانگریسی وزارتیں قائم ہوتے ہی پھر تلخی شروع ہوگئی اور یو۔پی، بہار اور دوسرے ہندو اکثریتی صوبوں میں اذان پر، نماز پر، قربانی پر اور محرم کے جلوس پر روک ٹوک اور حملے غلبے کے مظاہرے

کے لیے ضروری سے ہو گئے' یہاں تک کہ پولیس نے ان ہنگاموں میں لاپرواہی کا ثبوت دیا اور اگر کہیں حرکت میں آئی بھی تو مسلمانوں کے خلاف۔ کانگریسی حکومت نے سرکاری عمارتوں پر کانگریس کے جھنڈے لہرائے' بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا' تعلیم کے میدان میں واردھا سکیم اور ودیا مندر سکیم نافذ کرنے کی کوشش کی' اردو کو ہر شعبے سے بے دخل کیا جانے لگا' مختصر یہ کہ اس نے بڑے اہتمام سے مسلمانوں کو یہ محسوس کرایا کہ ان کی رائے اور مرضی کی کوئی قیمت نہیں اور انہیں اس ملک میں اکثریت کے تابع ہو کر رہنا پڑے گا۔ اس طرزِ عمل کا جواب ایک ہی ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو نہایت تیزی اور سرگرمی سے منظّم کیا جائے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے تنظیم کا کام پوری تندہی سے شروع کر دیا۔ جگہ جگہ مسلم لیگ کی شاخیں قائم ہوئیں' جلسے ہونے لگے' جلوس نکلنے لگے۔ اور جب اپریل 1938ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے خلاف مسلمانوں کی شکایت کی باقاعدہ تحقیقات کرنے کے لیے پیرپور کمیٹی بنائی گئی تو مسلم لیگ اور کانگریس میں پوری طرح ٹھن گئی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ جب منظرِ عام پر آئی اور ان مظالم اور ناانصافیوں کی تفصیل معلوم ہوئی' جو کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں سے روا رکھی تھیں' تو یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ بطورِ اقلیت آزاد ملک میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں۔

دوسری جنگ عظیم کا آغاز اور کانگریسی وزارتوں کا استعفاء

مسلم لیگ کی تنظیمی سرگرمیاں جاری تھیں' مسلم اکثریتی صوبوں کی اسمبلیوں کے اکثر مسلمان ارکان مسلم لیگ کے رکن بن چکے تھے اور پنجاب اور بنگال کے مسلمان وزراء نے کل ہند معاملات میں مسلم لیگ کی قیادت کو تسلیم کر لیا تھا' مسٹر محمد علی جناح اپنے خلوص و تدبر اور اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کی بنا پر قائد اعظم کے نام سے یاد کیے جانے لگے تھے' اور مسلم لیگ کا یہ دعویٰ پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا تھا کہ مسلم لیگ ہی وہ جماعت ہے جو مسلمانانِ ہند کی نیابت کرتی ہے اور کانگریس کو صرف ہندوؤں کی طرف سے بولنا چاہیے۔

ستمبر 1939ء میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ کانگریس نے حکومتِ برطانیہ سے مقاصدِ جنگ کی وضاحت چاہی اور اس میں حمایت کرنے کے لیے یہ شرط عائد کی کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی دی جائے گی۔ مسلم لیگ نے ایک طویل قرارداد میں اسلامی ممالک میں برطانوی پالیسی کے نقائص اور ہندوستان میں نئے آئین کے ماتحت کانگریسی حکومتوں کے قیام کے دوران میں مسلمانوں کی شکایات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ جب تک حکومت برطانیہ اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی شکایت کو دور کرنے کا وعدہ نہ کرے' مسلم لیگ جنگِ یورپ میں برطانیہ کی حمایت نہیں کر سکتی۔ اس قرارداد کی منظوری سے قبل بنگال کے وزیر اعظم مولوی

فضل الحق اور پنجاب کے وزیراعظم سر سکندر حیات خان برطانیہ کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کر چکے تھے‘ لیکن انہوں نے اپنے اعلانات کو انفرادی قرار دیتے ہوئے لیگ کے فیصلے کو تسلیم کر لیا‘ جس سے مسلم لیگ کا وقار بہت بڑھ گیا۔

حکومت ہند نے ملک کی مدافعت کے لیے جو سکیم تیار کی تھی وہ اس صورت میں کامیاب ہو سکتی تھی کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے باہمی اختلافات دور ہو جائیں‘ دونوں جماعتیں صوبائی حکومتوں میں شریک کار رہوں‘ مرکزی ایگزیکٹو کونسل میں ان کے نمائندے شامل کر لیے جائیں اور مرکز اور صوبوں کے درمیان ہم آہنگی قائم ہو جائے۔ چنانچہ وائسرائے نے ان جماعتوں کے رہنماؤں سے متعدد ملاقاتیں کیں۔ 11 ستمبر کو شاہِ انگلستان کے اعلان کی رو سے وفاق کی سکیم ملتوی کر دی گئی تاکہ مسلم لیگ اور والیانِ ریاست کے لیے تعاون کی ترغیب پیدا ہو جائے۔ مسلم لیگ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ التوا کے بجائے وفاق کو یکسر ترک کر دیا جائے‘ کیونکہ اس کا نتیجہ محض یہ ہوگا کہ جمہوری اور پارلیمانی حکومت کے بھیس میں فرقۂ اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی‘ لہٰذا ضروری ہے کہ آئندہ آئین کے مسئلے پر از سرِ نو غور کیا جائے اور کوئی ایسا دستور نافذ کیا جائے جسے مسلمان منظور نہ کریں۔ اُدھر کانگریس کا مطالبہ تھا کہ حکومت کی طرف سے مقاصدِ جنگ کی وضاحت کی جائے۔ اختتامِ جنگ کے بعد آزادئ مطلق دینے کا غیر مبہم اعلان کیا جائے‘ ملک کا آئندہ دستور وضع کرنے کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی قائم ہو‘ جس میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہ ہو‘ اور مرکزی حکومت کے اختیارات میں ہندوستانیوں کو حصہ دیا جائے۔ قائداعظم نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ ایسی دستور ساز اسمبلی کے ذریعے صرف اس فرقے کی رائے سے دستور وضع کیا جائے گا جس کی ملک میں عظیم اکثریت ہے۔ 18 اکتوبر کو وائسرائے نے حکومت کی پالیسی کا اعلان کیا‘ جس میں بتایا گیا کہ اختتامِ جنگ پر ملک معظم کی حکومت ہندوستانیوں کی رائے کی روشنی میں اور ہندوستانیوں کی مختلف پارٹیوں‘ فرقوں‘ مفاد کے نمائندوں اور والیانِ ملک کے مشورے اور تعاون سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی سکیم میں ترمیم کے لیے تیار ہوگی۔ اس طرح حکومت نے کانگریس کا یہ دعویٰ عملی طور پر رد کر دیا کہ وہ تمام ہندوستان کی نیابت کرتی ہے۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے اس بیان کی مذمت کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ وہ برطانیہ کی جنگی مساعی میں مدد نہیں دے سکتی اور وزارتوں کو حکم دیا کہ وہ مستعفی ہو جائیں۔

14 نومبر 1939ء تک کانگریس کی تمام صوبائی حکومتوں نے استعفاء دے دیا۔ آسام میں کانگریس کی مخلوط وزارت کی جگہ سر محمد سعد اللہ کی وزارت قائم ہوئی‘ جس نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کیا۔ سندھ میں پہلے ہی سے مسلم لیگی وزارت قائم ہو چکی تھی۔ پنجاب اور بنگال میں غیر کانگریسی حکومتیں موجود تھیں‘ جن کی کابینہ کے مسلمان وزراء مسلم لیگ کے رکن تھے۔ باقی صوبوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ 93 کے تحت گورنروں نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

چار پانچ ماہ تک کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کی آپس میں اور وائسرائے کے ساتھ مصالحت کے لیے گفت وشنید جاری رہی، لیکن اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ ہندو مسلم اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ کانگریس کو اپنی کل ہند نمائندہ حیثیت پر اصرار تھا۔ وہ مسلمانوں کے سیاسی، آئینی اور اقتصادی حقوق کو جداگانہ طور پر تسلیم کرنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ تھی۔ اس کی تمام مساعی اس نقطے پر مرکوز تھیں کہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ ہندو اکثریت کے ہاتھ میں دے دیا جائے، یہاں تک کہ رام گڑھ کے سالانہ اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ ہندو مسلم مسئلے کا فیصلہ صرف دستور ساز اسمبلی کرے گی۔ دوسری طرف قائداعظم اپنی کوشش اور تدبیر سے حکومت برطانیہ کو اس مقام تک لے آئے کہ اس نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور اس کی سکیم پر نظر ثانی کی تجویز مان لی اور ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کو اہم اور لازمی فریق تسلیم کر لیا۔

اب کانگریس نے بڑی شدّ ومدّ سے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ مسلم لیگ فرقہ وارانہ مسئلے کو اُبھار کر ملک کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ اس کے جواب میں قائداعظم نے اعلان کیا کہ: ''برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے اور مسٹر گاندھی ہندوستان اور مسلمانوں دونوں پر۔ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے نہ مسٹر گاندھی کو۔ ہم ان دونوں کے اثر سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔''

22 دسمبر 1939ء کو قائداعظم کی زیر ہدایت مسلمانوں نے کانگریسی حکومتوں کے خاتمے پر پورے ملک میں یوم نجات منایا، اور چھوٹے چھوٹے دیہاتوں سے بڑے بڑے شہروں تک ایسے وسیع پیمانے پر اور اتنے امن وضبط کے ساتھ مظاہرے کیے کہ یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستان کے مسلمان مسلم لیگ کے پرچم تلے منظّم اور متحد ہو چکے ہیں اور کانگریس پر سے ان کا اعتماد اٹھ چکا ہے۔

17-18 ستمبر 1939ء کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اپنا مطمحِ نظر اِن الفاظ میں پوری طرح واضح کر دیا تھا: ''آزاد ہندوستان میں آزاد وخود مختار اسلام، جس میں اپنے مذہبی، سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق و مفاد کی کامل حفاظت کے اطمینان کے ساتھ فرقۂ اکثریت کے دوش بدوش مسلمان زندگی کی سرگرمیوں میں مساویانہ شرکت کریں''۔ لیکن کانگریس نے مسلمانوں کے جائز حقوق اور مطالبات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور ہندو مسلم تصفیے کو دستور ساز اسمبلی پر موقوف کر کے گفت وشنید کا دروازہ بند کر دیا۔

1940ء کے آغاز میں قائداعظم کا ایک بیان انگلستان کے اخبار Time & Tide میں شائع ہوا، اس میں انہوں نے ہندوستان کی سیاسی الجھن کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ''وہ جمہوری طرزِ حکومت جو ایسے عناصر قوم کے تصور پر مبنی ہو جیسے انگلستان کے لوگ ہیں، ہندوستان جیسے ملکوں کے لیے بالکل مناسب نہیں ہو سکتا، جن کی آبادی مختلف قوموں پر مشتمل ہو اور یہی سادہ واقعہ ہندوستان کی

تمام آئینی بیماریوں کی جڑ ہے۔ انہوں نے انگریزوں پر یہ واضح کیا کہ ہندو دھرم اور اسلام دو مختلف تہذیبوں کی نیابت کرتے ہیں اور اپنے بنیادی عقائد اور طرزِ زندگی میں ایک سے دوسرا اس قدر مختلف ہے جتنی کہ یورپ کی اقوام ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دو مختلف قومیں ہیں' لہٰذا اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان میں ایک بڑی قوم ہے اور ایک چھوٹی قوم ہے تو جو پارلیمانی طرزِ حکومت اکثریت کے اصول پر مبنی ہوگا' لازماً اس کے معنی کثیر التعداد قوم کی حکومت کے ہوں گے۔'' یہی بات انہوں نے گاندھی جی کے ایک خط کے جواب میں لکھی: '' مجھے اس معاملے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے اور مجھے پھر کہنے دیجیے کہ ہندوستان ایک قوم نہیں ہے اور نہ ایک ملک ہے۔ یہ برصغیر ہے' جس میں بہت سی قومیں ہیں اور ہندو اور مسلمان ان میں دو بڑی قومیں ہیں''۔

قراردادِ پاکستان

مارچ 1940ء میں مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ 22 مارچ کو قائداعظم نے دوقومی نظریے کی مکمل وضاحت کی اور اس کی روشنی میں ملک کے آئینی مسئلے کا حل تجویز کیا۔ انہوں نے کہا: '' یہ مسئلہ' جو ہندوستان میں ہے' (دو) فرقوں کے درمیان نہیں بلکہ (دو) قوموں کے مابین ہے اور اسے بین الاقوامی ہی مان کر حل کیا جائے۔ اس کی صرف یہی صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے (دو) بڑی اقوام کے لیے جداگانہ قومی وطن منظور کیے جائیں' جن میں وہ خوداختیاری کے ساتھ قومی ریاستیں قائم کریں۔ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ برصغیر ہند کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹے چھوٹے جغرافیائی رقبے' جو یکجا رہنے کی صورت میں ایک ملک کہے جاتے تھے' اتنی ہی ریاستوں میں تقسیم کر دیے گئے جتنی ان میں قومیں آباد تھیں۔ جزیرہ نمائے بلقان میں سات یا آٹھ خودمختار ریاستیں ہیں' مگر ہندوستان کے اتحاد کے لیے اور ایک قوم کی بنیاد پر' جس کا کوئی وجود نہیں' یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ایک مرکزی حکومت ہونی چاہیے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اگر کسی ایسے جمہوری نظام کے تحت یکجا کیا جائے گا جو اقلیتوں پر مسلط کیا گیا ہو تو اس کے معنی صرف ہندو راج ہوں گے۔ مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔ قومیت کی ہر تعریف کی رو سے مسلمان ایک قوم ہیں اور چاہیے کہ ان کے پاس قومی وطن ہو' ان کا اپنا ملک ہو اور اپنی ریاست و دولت ہو''۔

23 مارچ کو عام اجلاس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ کوئی آئینی منصوبہ اس کے بغیر اس ملک میں قابلِ عمل اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگا' کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی ہو: حد بندی کر کے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے حسبِ ضرورت ردّ و بدل کر کے متصل وحدتوں کو ایسے منطقے بنا دیا جائے کہ وہ علاقے جن میں مسلمان با اعتبارِ تعداد اکثریت میں ہیں (جیسے ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی منطقوں میں) یکجا ہو کر خودمختار ریاستیں بن جائیں اور ان میں اقلیتوں کے لیے ان کے

مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفظ کی خاطر ان کے مشورے سے بقدرِ ضرورت مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات معین طور پر دستور کے اندر مہیا کیے جائیں، اسی طرح کے تحفظات ہندوستان کے دوسرے حصوں میں، جہاں ہندو اکثریت میں ہیں، وہاں کی اقلیتوں کے مشورے سے معین طور پر دستور کے اندر رکھے جائیں۔

خطبۂ صدارت یا قرارداد میں پاکستان کا لفظ نہیں آیا تھا۔ اسے محض تقسیمِ ہند کا ریزولیوشن کہا گیا، البتہ بیگم محمد علی نے اپنی تقریر میں اسے ''پاکستان'' کا ریزولیوشن کہا۔ پھر ہندو اخبارات نے طعن و طنز کے طور پر اس نام کو ایسا اچھالا کہ زبان زدِ عام ہو گیا اور بالآخر مسلم لیگ نے بھی اسے قبول کر لیا اور اس مملکت کا نام ''پاکستان'' ہی قرار دے دیا جس کے حصول کے لیے وہ کوشاں تھی۔

اس قرارداد کے منظور ہوتے ہی کانگریس اور اس کی ہم نوا جماعتوں کی طرف سے مخالفت کا آغاز ہو گیا۔ مخالفین کا کہنا تھا کہ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے، اس لیے وہ تقسیم نہیں ہو سکتا، اکثر ہندوستانی مسلمانوں کے اجداد ہندو تھے اور تبدیلیٔ مذہب سے ان کی قومیت نہیں بدل سکتی، پاکستان کے معاشی وسائل اس کی کفالت کے متحمل نہیں ہو سکتے، وغیرہ وغیرہ۔ مسلم لیگ کی طرف سے ان اعتراضات کے بڑے مدلل جوابات دیے گئے اور زبردست مخالفانہ پروپیگنڈے کے باوجود مسلمانانِ ہند میں یہ مطالبہ مقبول ہوتا چلا گیا۔

اگست کی پیشکش

جون 1940ء میں قائداعظم نے وائسرائے سے ملاقات میں اس بات پر زور دیا کہ حکومت مسلمانوں کی مرضی کے خلاف کوئی آئینی تجاویز پیش نہیں کرے گی، چنانچہ حکومتِ برطانیہ نے ''اگست کی پیشکش'' میں اعلان کیا کہ وہ کوئی ایسا نظامِ حکومت منظور نہیں کرے گی جسے ہندوستان کی قومی زندگی کے بڑے اور طاقتور عناصر قبول نہ کریں۔ حکومت جنگ کے بعد بااثر اور مقامی جماعتوں پر مشتمل دستور ساز اسمبلی بھی بنانے پر راضی ہو گئی تاکہ نیا آئین تیار ہو سکے۔ فی الحال تمام جماعتوں سے جنگی مساعی میں امداد کی درخواست کی گئی۔ چونکہ مسلم لیگ کو وائسرائے کی انتظامی کونسل میں صرف دو نشستوں کی پیشکش کی گئی تھی اس لیے مسلم لیگ نے اسے مسترد کر دیا۔ کانگریس نے بھی یہ پیشکش ٹھکرا دی اور گاندھی جی نے 1940ء میں ستیہ گرہ شروع کیا، جو زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا مقصد حکومت کو مجبور کرنا تھا کہ وہ اقتدار کانگریس کو منتقل کر دے۔ مسلم لیگ نے اس بنا پر اس کی مذمت کی کہ اس کا مطلب دس کروڑ مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بنانا تھا۔ مسلمان اس تحریک سے الگ رہے اور مسلم لیگ کی ہدایت پر تین مسلمان صوبائی وزرائے اعلیٰ سر سکندر حیات (پنجاب)، فضل الحق (بنگال) اور سر سعد اللہ (آسام) قومی دفاعی کونسل سے مستعفی ہو گئے۔ سر سلطان احمد اور بیگم شاہنواز کو ایسا نہ کرنے پر مسلم لیگ سے نکال دیا گیا، بعد میں فضل الحق کو بھی اسی باعث جماعت سے خارج کر دیا گیا۔

اس زمانے میں اتحادیوں کو جرمنی کے مقابلے میں پے در پے پسپائی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور برطانوی حکومت ہندوستان سے ہر ممکن امداد کی خواہاں تھی۔ ادھر جاپان بھی جنگ میں شریک ہو گیا اور جب اس کی فوجیں فلپائن، ملایا اور برما کو فتح کرتی ہوئی ہندوستان کی سرحد پر پہنچ گئیں تو 1942ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے ''منصفانہ اور مکمل حل'' کے لیے سر سٹیفورڈ کرپس کو خاص تجاویز دے کر بھیجا، جو دو حصوں پر مشتمل تھیں! پہلے حصے کا مطلب تھا کہ ہندوستان میں فوراً ایسی حکومت قائم کر دی جائے جس کے تمام ارکان ہندوستانی ہوں، صرف امورِ جنگ کی ذمہ داری تا اختتام جنگ حکومت برطانیہ کے ہاتھ رہے اور کمانڈر انچیف قومی حکومت میں وزیر جنگ ہو۔ دوسرے حصے کا مفہوم یہ تھا کہ جنگ کے خاتمے پر انتخابات ہوں اور مختلف صوبوں کی قانون ساز مجالس سے ان کے دس فی صد ارکان مجلس دستور ساز کے لیے چنے جائیں۔ یہ بھی یقین دلایا گیا کہ اس مجلس کا بنایا ہوا دستور حکومت برطانیہ منظور کرے گی، مرکزی حکومت وفاقی ہوگی، اگر کوئی صوبہ ہند یونین سے الگ رہنا چاہے گا تو اسے اجازت ہوگی اور مذہبی اور نسلی اقلیتوں کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جائے گا۔ یہ تجاویز کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے رد کر دیں۔ تاریخِ پاکستان کے نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں پہلی بار برطانوی حکومت نے برصغیر کے بعض حصوں کی خودمختاری اور علیحدگی کے حق کو تسلیم کیا اور یہ مطالبۂ پاکستان کی روز افزوں مقبولیت کا ثبوت تھا۔

''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک

جنگ عظیم کی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے 8 اگست 1942ء کو کانگریس نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی قرارداد منظور کر کے اقتدار پر قبضہ کرنے کی غرض سے ملک گیر تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ بہت جلد اس نے ایک جارحانہ اور متشددانہ شکل اختیار کر لی۔ حکومت نے انتہائی سختی سے اسے دبا دیا۔ بہت سے ممتاز کانگریسی رہنما بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیے گیے اور کئی ماہ بعد امن قائم ہوا۔ مسلمان من حیث المجموع اس تحریک سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ مسلم لیگ نے اس تحریک کی مخالفت کی، مگر حکومت کے تشدد کی بھی مذمت کی۔

اسی دوران میں مسلم لیگ نے مسلم اکثریت کے صوبوں بنگال، آسام، سندھ اور سرحدی صوبے میں وزارتیں بنا کر مسلمان عوام پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ پنجاب میں سر خضر حیات ٹوانہ نے، جو سر سکندر کی وفات (1942ء) کے بعد پنجاب کی یونینسٹ حکومت کے سربراہ بنے تھے، قائداعظم کی ہدایت کے باوجود اپنی پارٹی کا نام بدلنے سے انکار کر دیا، لہٰذا انہیں اور ان کے ہم نواؤں کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کو ختم کر کے وہاں مسلم لیگی وزارت قائم کرنے کی مہم شروع کر دی۔

''اچاریہ فارمولا'' اور گاندھی' جناح مذاکرات

مئی 1944ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد گاندھی جی کو احساس ہوا کہ مسلم لیگ کے تعاون کے بغیر انگریزوں کے خلاف کوئی کارروائی مؤثر ثابت نہیں ہوسکتی' چنانچہ وہ راج گوپال اچاریہ کی تجویز کی بنیاد پر مسلم لیگ سے سمجھوتا کرنے کے لیے قائداعظم سے ملنے پر تیار ہوگئے۔ ''اچاریہ فارمولا'' میں مطالبۂ پاکستان کو اصولی طور پر تسلیم کرنے کے علاوہ یہ تجویز کیا گیا تھا کہ جنگ کے بعد ایک کمیشن مقرر ہوگا جو مسلم اکثریت کے علاقوں کی حد بندی کرے گا اور بالغ رائے دہی کے اصول پر ان علاقوں کے عوام یہ فیصلہ کریں گے کہ وہ ہندوستان سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اگر اکثریت نے علیحدگی کے حق میں فیصلہ دے دیا تو اس صورت میں دونوں مملکتیں دفاع' تجارت' رسل ورسائل اور دوسرے ضروری امور میں تعاون کے لیے باہمی معاہدہ کریں گی۔ اس فارمولے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ عبوری حکومت میں شرکت' کانگریس سے تعاون اور مسلم مملکت کے قیام اور حد بندی کے سلسلے میں اکثریت پر مکمل اعتماد کرے۔

دونوں رہنماؤں کے درمیان اٹھارہ روز تک مذاکرات جاری رہے' لیکن کوئی سمجھوتا نہ ہوسکا' کیونکہ ایک تو ہندو اکثریت والی عبوری حکومت پر مکمل اعتماد مسلم لیگ کے لیے گزشتہ تجربات کی بنا پر قابل قبول نہ تھا' دوسرے یہ کہ ایک طرف گاندھی جی نے دونوں ریاستوں کے باہمی معاہدۂ تعاون میں امور خارجہ اور مالیات کو بھی شامل کرنے پر زور دیا اور دوسری طرف وہ اس بات پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو قومیں اور مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرلیں۔ بہرحال اس کا یہ نتیجہ ضرور برآمد ہوا کہ دنیا کی نظر میں گاندھی جی نے تقسیم ہند کا اصول تسلیم کرلیا۔

ویول منصوبہ

1945ء میں جنگ عظیم کے خاتمے پر ایک بار پھر ملک کی آئینی گتھی سلجھانے کے لیے نئے وائسرائے لارڈ ویول نے ایک منصوبہ پیش کیا' جس کی رو سے مرکز کی ایگزیکٹو کونسل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے مساوی نمائندگی تجویز کی تھی۔ اس سلسلے میں وائسرائے نے ہندوستانی رہنماؤں کی ایک کانفرنس شملے میں طلب کی' جو ناکام رہی۔ ناکامی کا بڑا سبب یہ تھا کہ کانگریس کو برصغیر کی جملہ اقوام کی نمائندگی کا دعویٰ تھا اور وہ تمام ہندو نشستوں کے علاوہ مسلم نشستوں میں بھی اپنا حصہ چاہتی تھی' ' قائداعظم اسے تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ اور ان کا مطالبہ تھا کہ مسلمان نمائندوں کی نامزدگی کا حق صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے۔ کانفرنس کی ناکامی کے باوجود یہ بات واضح ہوگئی کہ دونوں جماعتوں کے دعوے انتخابات ہی کے ذریعے پرکھے جاسکتے ہیں۔